www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

July-August 2024 • Rs. 40

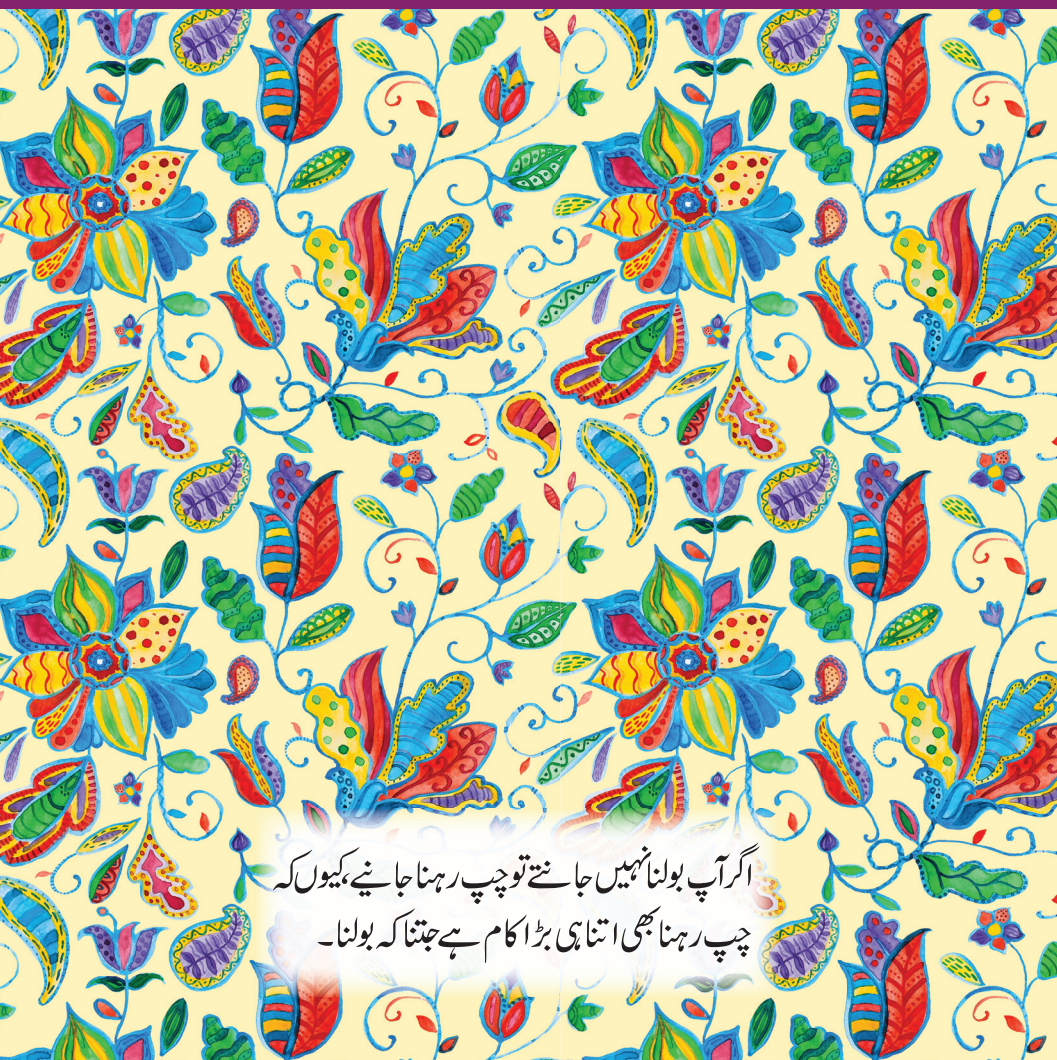

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Jul-Aug, 2024 | Volume 49 | Issue 4

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

مسائلِ ملّت	4	عالمی دعوت کا نظام	21
حکمت اور شکر	5	آزادیِ رائے کا ماحول	22
پیغمبر کا کردار	6	امن اور انصاف	23
امید کا نظام	7	نیا زمانہ، نئی پلاننگ	24
فہم قرآن	8	قوم کی ترقی	27
قرآن کی تفسیر	9	قصور اپنا نکل آیا	28
قبولیتِ دعا میں تاخیر	10	کوالیٹی کی اہمیت	29
نیکی کا عمل	11	لفظ اور معنی	30
نرمی کا سلوک	12	زمین اپنے خاتمہ	
دانش مندانہ طریقہ	13	کی طرف	31
آخرت کا معاشرہ	14	آئڈیالوجی نہ کہ تلوار	33
بڑھاپا آخری موقع	15	مطالعۂ حدیث	
بے صبری نہیں	16	(شرح مشکاۃ المصابیح)	35
نتیجہ خیز عمل	17	ڈائری 1986	41
بے تحقیق خبر	18	ایک رجل سعید	
امیر معاویہ کا رول	19	کا انتقال	46
جدید ذہن اور اسلام	20	خبر نامہ اسلامی مرکز	49

फिरक़ावाराना मेलजोल	1
स्वाभाविक सज्दा	2
कारोबारी स्थायित्व	4
चालीस साल बाद	6
शहद का सबक़	8
चुप की ताक़त	9
एक मिसाल	11
एकतरफ़ा तरीका	12
अशुभ से शुभ	13
कुछ मिसालें	15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

مسائلِ ملّت

فردِ ملّت کے مسائل کا جو حل ہے، وہی خود ملّت کے مسائل کا حل بھی ہے۔ ملت کا ایک فرد اپنی ذاتی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح مجموعہ افراد جس کا نام ملت ہے، اس کے مسائل بھی اس کی اپنی تعمیری کوششوں سے حل ہوں گے۔ کوئی دوسرا اس کے مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

اس دنیا میں ایک بھائی کبھی دوسرے بھائی کے لیے نہیں کماتا۔ کوئی رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کے لیے لڑائی نہیں لڑتا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے۔ اس لیے ہر شخص پہلی فرصت میں "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر اپنی زندگی کی جدوجہد میں لگ جاتا ہے۔

مگر عجیب بات ہے کہ ملّت کا سوال سامنے آتے ہی تمام لوگ بالکل دوسرے انداز سے سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملّت کے مسائل کا تعلق خود ملت سے نہیں بلکہ دوسروں سے ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے، انتظامیہ سے ہے، فلاں فلاں متعصب جماعتوں اور گروہوں سے ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ ملّی مسئلہ کے ذمہ دار فلاں فلاں سرکاری افسر ہیں، اس لیے ان افسروں کو معطل کراؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ متعصب جماعتیں اس کی ذمہ دار ہیں، ان کی سازشوں کا پردہ فاش کرنے کے لیے ان کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کیے جائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حکمراں پارٹی اس کی ذمہ دار ہے، اس لیے الیکشن میں اس پارٹی کے امیدواروں کے خلاف ووٹ دے کر انھیں شکست دو۔ یہ باتیں مضحکہ خیز حد تک غلط ہیں۔ اور اس غلطی کے ذمہ دار مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ یہ رہنما اپنے ذاتی مسائل کو تو ہمیشہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملی مسائل کے بارے میں پرجوش تقریریں کرکے پوری قوم کا مزاج بگاڑتے ہیں۔ وہ ملت کے اندر تعمیر کے بجائے احتجاج کا ذہن بناتے ہیں۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ سب سے پہلے ملت کے افراد میں شعور پیدا کرنے کا کام کیا جائے۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کیے جائیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے: بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالیں جو ان کے جی میں ہے (13:11)۔ یعنی جو قوم کے زوال یافتہ افراد کے دلوں میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اگر خدا کے اجتماعی نصرت کو پانا چاہتا ہے تو اس کو اپنے افراد کی اصلاح پر اپنی طاقت کو صرف کرنا چاہیے۔

حکمت اور شکر

قرآن کی سورہ لقمان کی ایک آیت یہ ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (31:12)۔ یعنی، اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شکر سے پہلے حکمت ضروری ہے۔ شکر بلاشبہ سب سے بڑی عبادت ہے، لیکن صاحبِ شکر بننے سے پہلے ضروری ہے کہ آدمی صاحبِ حکمت بن چکا ہو۔ شکر اگر شکر ہے تو حکمت پری شکر (pre-shukr) کی حیثیت رکھتی ہے۔

شکر کی نسبت سے حکمت (wisdom) کی اہمیت یہ ہے کہ فطرت کے قانون کے تحت زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ یہاں ناشکری کے اسباب موجود رہتے ہیں۔ کوئی انسانی معاشرہ کبھی شکایت، منفی سوچ اور ناخوشگوار تجربے سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کے حالات انسان کو نہایت آسانی سے ناشکری کی نفسیات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس کا دماغ نفرت اور شکایت کے خیالات سے بھر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شکر کی نفسیات میں جینے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو قرآن میں حکمت کہا گیا ہے۔ حکمت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ منفی حالات کے باوجود مثبت انداز میں سوچ سکے۔ شکایت کے اسباب کے باوجود وہ شکایت کا ذہن اپنے اندر نہ پیدا ہونے دے۔ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے بچائے۔ ناانصافی کا تجربہ ہونے کے باوجود وہ ناانصافی اور حق تلفی سے اوپر اٹھ کر سوچے۔

اسی قسم کی اعلیٰ سوچ کا نام حکمت ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اس قسم کی اعلیٰ سوچ پیدا کریں، انھیں کے لیے ایسا ممکن ہے کہ ان کے اندر حقیقی معنوں میں شکر کے جذبات پرورش پائیں۔ شکر کے لیے ایک تیار ذہن (prepared mind) درکار ہے۔ تیار ذہن کے بغیر شکر کی عبادت ممکن نہیں۔

پیغمبر کا کردار

قرآن کی سورہ ص میں پیغمبر کے کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (38:86)۔ یعنی، کہو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔

قرآن کی اس آیت میں پیغمبر کے کردار کو دو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے —ایک یہ کہ پیغمبر اپنے مخاطبین سے اجر کا طالب نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ وہ تکلف کرنے والا انسان نہیں ہوتا۔ یہ دونوں باتیں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ وہ پیغمبر کی داعیانہ شخصیت کو بتاتی ہیں۔ یعنی پیغمبر کی شخصیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے مدعو سے کسی رٹرن (return) کا طالب نہیں ہوتا ہے اور پیغمبر کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ تکلف سے بالکل پاک انسان ہوتا ہے۔

تکلف کا مطلب تصنع (to pretend) ہے، یعنی ایک ایسا کام کرنا جو آدمی کے دل کی آواز نہ ہو، بلکہ وہ کسی مصلحت کی بنا پر دکھاوے کے طور پر اس کو اختیار کرے۔ پیغمبر جو کچھ کرتا ہے، وہ تمام تر داخلی محرک کے تحت کرتا ہے۔ وہ اپنا دعوتی کام دوسروں سے کسی امید کی بنا پر شروع نہیں کرتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے، خود اپنے داخلی تقاضے کے تحت کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کام کی دو صورتیں ہیں —ایک، بطور پیشہ (as a profession) کام کرنا، اور دوسرا، بطور مشن (as a mission) کام کرنا۔ جب کوئی آدمی بطور پیشہ ایک کام کرتا ہے تو پہلے دن سے اس کو یہ امید ہوتی ہے کہ لوگوں کی طرف سے اس کو فلاں قسم کا مادی فائدہ حاصل ہوگا۔ مشن کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مشن والے آدمی کے لیے مشن اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے، نہ کہ دوسروں کی نسبت سے روزگار حاصل کرنا۔

یہی معاملہ داعی کا ہے۔ حق کے داعی کو بھی اسی پیغمبرانہ ماڈل کو اختیار کرنا ہے۔ سچا داعی وہ ہے جس کے لیے دعوت کا کام، کسی بھی اعتبار سے، پروفیشن نہ ہو، بلکہ اس کام کی حیثیت اس کے لیے تمام تر مشن کی ہو۔ اس صفت کے بغیر کوئی شخص داعیِ حق کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

امید کا نظام

قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے پہنچتی ہے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے (42:30)۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

آدمی جن مسائل سے دوچار ہوتا ہے اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر نربھر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ تاکہ ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے ازسرِ نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

فہم قرآن

کہا جاتا ہے کہ ”قرآن مجید ایک مرتب کتاب ہے اور اس کے نظم کو جانے بغیر اس کے معانی تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ نظم قرآن فہم قرآن کی بنیاد ہے۔“ یہ جملہ ایک بیان ہے۔ اس قسم کا کوئی بیان ہمیشہ کسی دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس معاملے میں دلیل صرف ایک چیز ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن یا حدیث میں اس مفہوم کا ایک بیان لفظاً موجود ہو۔ اس معاملے میں کسی قسم کی استنباطی دلیل کافی نہیں۔ جب تک یہ بات قرآن وسنت میں لفظاً موجود نہ ہو، وہ صرف ایک مفروضہ ہے، جو استنباط کے درجے میں رہے گا، اس کا درجہ ہرگز ایک مدلل بیان کا نہیں ہوسکتا۔

مثلاً ایک شخص اگر یہ کہے کہ قرآن فہمی کے لیے تقویٰ ضروری ہے، تو اس کے پاس قرآن کی دلیل موجود ہوگی، جس میں یہ کہا گیا ہے: وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ (2:282)۔ اسی طرح کوئی یہ کہے کہ قرآن فہمی کے لیے تدبر ضروری ہے تو اس کے پاس بھی حوالے کے لیے یہ آیت موجود ہوگی: لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ (38:29)۔ اسی طرح قرآن میں ایک مقام پر پہاڑ اور دوسرے فطری اشیاء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد یہ فرمایا گیا ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (35:28)۔ اس پر تدبر کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یونیورس کا علم قرآن فہمی میں مددگار ہے۔ لیکن جو شخص یہ کہے کہ نظم آیات کا علم قرآن فہمی کے لیے کلید کا درجہ رکھتا ہے، تو اس کو اس قسم کی کوئی صریح دلیل دینی چاہیے۔

اس معاملے پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سارے قرآن میں کہیں بھی لفظاً یہ بات موجود نہیں ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے۔ اس کے برعکس، یہ بات لفظاً موجود ہے کہ تقویٰ کی صفت پیدا کرو تو تم قرآن کو سمجھنے والے بن جاؤ گے، یا تدبر کی صفت پیدا کرو تو تم قرآن کو سمجھنے والے بن جاؤ گے۔ ایسی حالت میں یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کوئی طالب علم کس طرح ایسا کرے کہ قرآن فہمی کا جو اصول قرآن میں لفظاً موجود ہے، اس کو وہ چھوڑ دے، اور جو اصول قرآن میں لفظاً موجود نہیں ہے، اس کو وہ اختیار کرے۔

قرآن کی تفسیر

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (3:104)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: اور چاہیے کہ تم لوگوں میں ایک گروہ ہو، جو دعوت دے بھلائی کی طرف، اور تاکید کرے نیکی کی، اور منع کرے برائی سے، اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس ترجمے کے مطابق اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ صرف رکمنڈیشن (recommendation) کے معنی میں ہے، وہ آبلِگیشن (obligation) کے معنی میں نہیں۔ لیکن لوگوں نے اس کی تفسیر اپنے ذوق کے مطابق کی ہے، اور اس کی تفسیر ایسے الفاظ میں کی ہے، جو آیت کے الفاظ کے مطابق نہیں۔ مثلاً صاحب تدبر قرآن نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

”ہمارے نزدیک اس آیت سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علی منہاج النبوت کا قیام تھا اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ کا تعلق صرف اس مخصوص گروہ ہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اشارہ پوری امت کی طرف ہے کہ جو امت اعتصام باللہ کے لیے یہ اہتمام کرے گی وہی دنیا اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے والی بنے گی۔“ (تدبر قرآن، جلد 2، صفحہ 155)

آیت کے الفاظ کے مطابق، جو چیز رضا کارانہ درجے میں مطلوب تھی، اس کو الفاظ بدل کر حکم کے درجے میں مطلوب بنا دیا گیا۔ ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بات امت کے لیے حکم کے درجے میں ہے۔

قبولیتِ دعا میں تاخیر

ایک حدیث قدسی ان الفاظ میں آئی ہے: ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ دَعْوَتُهُمْ، الإِمَامُ العَادِلُ، وَالصَّائِمُ حِينَ يُفْطِرُ، وَدَعْوَةُ المَظْلُومِ يَرْفَعُهَا فَوْقَ الغَمَامِ، وَتُفَتَّحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَيَقُولُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: وَعِزَّتِي لَأَنْصُرَنَّكِ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2526)۔ یعنی تین آدمی کی دعا رد نہیں کی جاتی ہے۔ انصاف پسند حاکم، روزہ دار جب کہ وہ افطار کرتا ہے، اور مظلوم کی دعا۔ اللہ ان دعاؤں کو بادلوں کے اوپر اٹھاتا ہے، اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور اللہ کہتا ہے: میرے عزت کی قسم میں ضرور تمھاری مدد کروں گا، اگرچہ دیر میں ہو۔

اس حدیث میں دعا کی قبولیت کے بارے میں تین الفاظ آئے ہیں — مظلوم، عادل، اور صائم۔ مگر یہ تین الفاظ محدودیت کے لیے نہیں ہیں، بلکہ وہ علامتی طور پر ہیں، یعنی یہ حدیث حقیقی (genuine) دعا کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے رب سے سچے دل سے ایک دعا کرے، اور اس کی یہ دعا ایک حقیقی دعا ہو، یعنی وہ دعا جو اللہ رب العالمین کے نزدیک قبولیت کا استحقاق رکھتی ہو، تو ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اگرچہ بندے کو اس کی قبولیت کے لیے انتظار کرنا پڑے۔

انتظار کی شرط اسی لیے ہے کہ اللہ رب العالمین کے اپنے کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کی رعایت ہی سے دعا قبول کی جاتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دعا کے بعد وہ اس کی قبولیت کے لیے انتظار کرے۔ انتظار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس مدت تک وہ صبر کرے، جب کہ اللہ رب العالمین کے قانون کے مطابق، اس کی قبولیت کی شرط پوری ہو۔

قبولیت دعا میں تاخیر خود بندے کی مصلحت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کوئی بندہ جب دعا کرتا ہے، تو وہ خود اپنے تقاضے کے مطابق دعا کرتا ہے، لیکن دعا کی قبولیت کا وقت اللہ رب العالمین کی طرف سے طے کیا جاتا ہے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ پرامید رہے، وہ مایوسی کے بغیر رحمت الٰہی کے نزول کا انتظار کرے۔

نیکی کا عمل

قرآن کی ایک آیت کا ایک جزء یہ ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ (2:143)۔ یعنی اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ بیشک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا، مہربان ہے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو آپ بیت المقدس کی جانب منھ کرکے نماز ادا کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ہجرت کے تقریباً سترہ ماہ بعد قبلہ کی تبدیلی کا حکم آیا تو پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے اپنا قبلہ بیت المقدس کو ترک کرکے کعبہ قرار دے دیا۔ اس وقت کچھ لوگوں کو یہ شک ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھوں نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ادا کی ہیں، وہ ضائع ہوجائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کا ایک توسیعی مفہوم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک انسان، جو نیکی کا عمل کرتا ہے، اور دین کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔ اگر اس سے کسی وجہ سے کوئی خلافِ دین عمل کا ارتکاب ہو جائے تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی نیت کو دیکھتا ہے، وہ انسان کے ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ ایسے انسان کے عمل کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔

ظاہری عمل انسان کی اندرون کی ایک ظاہری تصویر ہے، اصل حقیقت تقویٰ ہے۔ چنانچہ اگر کسی وجہ سے ایسے انسان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوجائے، تو اس کو ناامیدی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ سے بھرپور امید رکھنی چاہیے کہ وہ اس کی نیکی کو برباد نہیں کرے گا۔ اس حقیقت کو قرآن کی دوسری آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کردیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

نرمی کا سلوک

ایک واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صحابہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ساتھ میں عورتیں بھی تھیں۔ کچھ عورتوں کو ایک اونٹ پر بٹھایا گیا تھا، جس کو انجشہ نامی ایک صحابی ہانک رہے تھے۔ انھوں نے راستے میں جب اونٹ تیز چلایا، تو رسول اللہ نے کہا: ارْفُقْ يَا أَنْجَشَةُ، وَيْحَكَ بِالقَوَارِيرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6209)۔ یعنی اے انجشہ، اللہ تم پر رحم کرے، نرمی کا معاملہ کرو ان قواریر (شیشوں) کے ساتھ۔ اس حدیث میں قواریر کا لفظ تمثیلی طور پر عورتوں کے بارے میں آیا ہے، یعنی عورتیں شیشے کی مانند ہیں، ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔ اگر تم نے سختی کا طریقہ اختیار کیا تو وہ ٹوٹ جائیں گی۔ زندگی میں سختی اور نرمی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی بات کو فارسی میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: درشتی و نرمی بہ ہم در بہ است۔

خالق نے مرد کو سختی کے اوصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور عورت کو نرمی کے اوصاف کے ساتھ۔ جیسے گلاب کے درخت کا کانٹا سختی کی مثال ہے، اور اس کا پھول نرمی کی۔ ان میں سے کوئی افضل یا غیر افضل نہیں۔ زندگی میں دونوں کی ضرورت یکساں طور پر ہوتی ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے، جو اس حقیقت کو سمجھے، اور نرمی و سختی دونوں زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال کرے۔

اس حقیقت کو ایک اور آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25)۔ یعنی اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے، اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کڑی دھات میں بھی فائدہ ہے، اور نرم دھات میں بھی فائدہ۔ یہی معاملہ انسانی مزاج کا ہے۔ دانش مند وہ ہے، جو مزاج کے اس فرق کو جانے، اور ہر صفت کو اس کے صحیح موقع پر استعمال کرے۔

اس حدیث میں نرمی کی بات کو عورت کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن توسیعی مفہوم میں یہ بات پوری انسانیت کے اعتبار سے ہے۔ نرم مزاجی اہلِ ایمان کی عام صفت ہے (الفرقان، 25:63)۔ وہ ہر حال میں مطلوب ہے۔

دانش مندانہ طریقہ

صحابیِ رسول عمیر بن حبیب انصاری نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: مَنْ لَا يَرْضَى بِالْقَلِيلِ مِمَّا يَأْتِي بِهِ السَّفِيهُ يَرْضَى بِالْكَثِيرِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 2258)۔ یعنی جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا، اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا۔

صحابی کے اس قول میں اجتماعی زندگی کی ایک حکمت کو بتایا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ مختلف قسم کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے ایسا تجربہ پیش آئے گا جو اس کی مرضی کے خلاف ہوگا، ایسے موقع پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ اعراض کیا جائے، نہ کہ ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔

اگر آپ ایسے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں تو وہ ہمیشہ چین ری ایکشن (chain reaction) کا سبب بنے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہمیشہ خارجی مسائل میں الجھے رہیں گے، اور کبھی اپنے منصوبے کے مطابق موثر عمل شروع نہ کر سکیں گے۔ دوسروں کے خلاف کارروائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خود اپنے کام میں استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو دوسروں کی مخالفت میں ضائع کر دیا۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اوائڈنس (avoidance) کا طریقہ۔ اس طرح کے معاملے میں یہی واحد طریقہ قابل عمل ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس معاملہ میں ورک (work) کرنے والا نہیں۔

اعراض بامقصد انسان کی سوچی سمجھی حکیمانہ روش ہے۔ بامقصد انسان دوسرے کی طرف سے پیش آنے والے ناخوش گوار تجربے پر اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے، جہاں پہنچنا اُس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اعراض کا طریقہ اختیار کر کے راستہ کے ہر اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔ وہ اپنے وقت اور اپنی انرجی دونوں کو بچاتا ہے، تاکہ وہ کسی رُکاوٹ کے بغیر اپنی منزل تک پہنچ سکے۔

آخرت کا معاشرہ

قرآن میں تخلیق کے منصوبے کے بارے میں بتایا گیا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (67:2)۔ یعنی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔

اللہ رب العالمین نے اپنے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، انسان کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک، موجودہ دنیا کی زندگی ہے، جس میں انسان آج جی رہا ہے۔ دوسری زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ موجودہ دنیا بطور نرسری وجود میں لائی گئی ہے۔ یعنی وہ دنیا جہاں احسن العمل انسانوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے (الملک، 67:2)۔ جب احسن العمل انسانوں کے انتخاب کا پراسس مکمل ہو جائے گا تو موجودہ دنیا ختم کر دی جائے گی۔ اس کی جگہ ایک اور دنیا وجود میں لائی جائے گی، یعنی آخرت کی دنیا۔ آخرت کی دنیا اصل مقصود ہے، اور وہ ابدی دنیا (eternal world) ہے۔ اس مطلوب دنیا کے لیے احسن العمل انسانوں کے انتخاب کا عمل موجودہ دنیا میں جاری ہے۔

جب موجودہ انسانی تاریخ کا خاتمہ کر کے دوسری ابدی دنیا بسائی جائے گی، یعنی آخرت کی دنیا تو احسن العمل انسانوں کو ان کے عمل کے اعتبار سے چار گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس کا ذکر قرآن کی سورہ النساء میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا (4:69)۔ یعنی اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی پیغمبر اور صدیق اور شہید اور صالح۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔ قرآن کی اِس آیت میں چار ایسے گروہوں کا ذکر ہے جو احسن العمل ہونے کی وجہ سے اللہ کے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ یہ آیت اوپر مذکور آیت کی تفسیر ہے۔ وہ چار گروہ یہ ہیں — انبیا، صدیقین، شہدا، اور صالحین۔ یہاں شہدا سے مراد جان دینے والے نہیں ہیں، بلکہ لوگوں کے سامنے اللہ کے پیغام کے گواہ بننے والے، یعنی حق کے داعی۔

بڑھاپا آخری موقع

بڑھاپا کو عام طور پر ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپا کسی انسان کے لیے ایک ایسی حقیقت کی یاد دہانی ہے، جس کا ادراک انسان کو بڑھاپے سے پہلے نہیں ہوتا۔ اللہ رب العالمین کی نعمتیں انسان کو ہر لمحہ ملتی رہتی ہیں۔ مگر انسان کی ایک کمزوری ہے کہ وہ ملی ہوئی نعمتوں کو فار گرانٹیڈ (for granted) لیتا رہتا ہے۔ بڑھاپا کسی انسان کی زندگی میں اس مفروضہ کو توڑ دیتا ہے۔ بڑھاپا انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ملی ہوئی نعمتوں کو اللہ رب العالمین کا یک طرفہ عطیہ سمجھے، اور اس پر اللہ رب العالمین کا شکر ادا کرے۔

انسان عام طور پر اپنی جوانی میں غفلت کی زندگی گزارتا ہے۔ بڑھاپا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آخری طور پر چوکنا ہو جائے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں کو شعوری طور پر منصوبۂ تخلیق کے مطابق گزارے۔ بڑھاپا کسی انسان کے لیے ویسا ہی ہے، جیسا نیوٹن کے لیے ایپل شاک (apple shock) تھا۔

بڑھاپا انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو جان لے جن کو وہ اب تک نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ بڑھاپا انسان کو آخری طور پر یہ ریلائز (realize) کرواتا ہے کہ وہ اس دنیا سے جانے سے پہلے اپنے آپ کو مثبت سرگرمیوں میں لگائے، وہ خود کو اس سے بچائے کہ زندگی کے آخری لمحات کو مثبت سرگرمیوں میں استعمال کرنے سے چوک جائے، یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلا جائے۔ بڑھاپا کسی انسان کے لیے اس کی زندگی کا آخری موقع ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے کوئی دوسرا موقع نہیں۔

بڑھاپا پوچھ کر نہیں آتا اور نہ ہی دور کرنے سے واپس جاتا ہے۔ بڑھاپا کسی انسان کے لیے اس کی زندگی کی آخری دستک ہے۔ جو آدمی بڑھاپے کی دستک کو نہ سنے، وہ ہمیشہ کے لیے ایک محروم انسان بن جائے گا۔ بڑھاپا آدمی کے لیے زندگی کا آخری موقع ہے۔ اپنی توبہ کے لیے اور دوسروں کو زندگی کا تجربہ دینے کے لیے۔

بے صبری نہیں

میں نے اپنی پوری زندگی مطالعہ میں گزاری ہے۔ میں نے جب انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ وہی انسان کامیاب ہوسکتا ہے، جو مستقل مزاج ہو۔ لیکن جس کے اندر گراس ہاپر (grasshopper) والا مزاج ہو، یعنی جو مستقل مزاجی کے ساتھ کسی ایک چیز پر ٹک کر نہیں رہتا ہو، وہ ہر میدان میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل مزاجی سے انسان کو کامیابی ملتی ہے۔ کیوں کہ فطری قانون کے مطابق، اس دنیا میں کامیابی چند لمحوں کی محنت سے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے صبر کے ساتھ لگاتار کوشش کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل (1874-1965) کا ایک قول ہے — مستقل کوشش، نہ کہ قوت یا عقل، ہمارے پوٹنشل کو ایکچول بنانے کی چابی ہے:

Continuous effort, not strength or intelligence, is the key to unlocking our potential.

یہ صرف دنیوی امور کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ دینی امور میں بھی یہی مستقل کوشش پسندیدہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ کو سب سے محبوب ہے (أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟)، آپ نے کہا کہ جو مسلسل کیا جائے اگرچہ کم ہو: أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلّ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 782)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کسی چیز کو پانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دوسری چیزوں کو مینج کرنے کا معاملہ بھی شامل ہوجاتا ہے، خواہ وہ دوسرے انسانوں کا معاملہ ہو یا کوئی اور چیز۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو مینج کرتے ہوئے انسان کی کوشش کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے انسان کو اس کی کوشش کا نتیجہ فوراً نہیں مل پاتا، اس کو مسلسل کوشش کرنا پڑتا ہے۔ اس کو جلد بازی کے بجائے تدریج کے ذریعہ اپنا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔

نتیجہ خیز عمل

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے سوال کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ صبر۔ انھوں نے کہا کہ صبر کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے — مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا۔

انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ صبر کا حکم قرآن میں ہے۔ مگر صبر کوئی مطلق چیز نہیں۔ جب کھلم کھلا اشتعال انگیزی کی جائے۔ جب ہم صاف طور پر دیکھیں کہ مسلمانوں کے اوپر زیادتی کی جارہی ہے تو اس وقت صبر کیسے کیا جائے گا۔ ایسی حالت میں صبر کرنا تو بزدلی اور شکست خوردگی کے ہم معنی ہوگا۔

میں نے کہا کہ آپ نے صبر کا معیار غلط قائم کیا ہے۔ صبر کے اختیار یا ترک کا معیار یہ نہیں ہے کہ صبر کرنے میں آپ کو بزدلی یا شکست خوردگی نظر نہ آئے تو آپ صبر کریں اور جب صبر کا طریقہ آپ کو بزدلی اور شکست خوردگی دکھائی دے تو آپ صبر کو چھوڑ دیں۔ یہ جذباتیت ہے، جب کہ معیار ہمیشہ اصولی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔ صبر کا حقیقی معیار صرف ایک ہے، اور وہ رزلٹ (نتیجہ) ہے۔ صبر کا اصول صرف اس وقت توڑا جاسکتا ہے جب کہ اس میں کوئی مثبت نتیجہ ملنے والا نہ ہو، بصورت دیگر، صبر کی روش پر قائم رہنا ضروری ہوگا۔ خواہ بظاہر وہ بزدلی اور شکست خوردگی کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

قدیم مکہ میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی اشتعال انگیزی جاری تھی۔ ہر قسم کا ظلم ان پر کیا جارہا تھا۔ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان ظالموں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمر، ابھی ہم تھوڑے ہیں (يَا عُمَرُ، إِنَّا قَلِيلٌ) البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 3، صفحہ 230۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جب قلیل ہوں اور فریقِ مخالف کثیر ہو تو ظلم کے باوجود ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ ایسے اقدام کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسلام میں صرف اسی اقدام کی اجازت ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جو اقدام بے نتیجہ ہو کر رہ جائے یا جس اقدام کا الٹا انجام نکلنے والا ہو، وہ سنتِ رسول کے خلاف ہے۔ اور جو عمل سنتِ رسول کے خلاف ہو وہ بلاشبہ اللہ کے یہاں غیر مقبول قرار پائے گا۔ نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ مقرر کرنا اسلام ہے، اور نتیجہ سے بے پروا ہو کر جوش وجذبہ کے تحت اقدام کرنا نادانی۔

بے تحقیق خبر

ایک مرتبہ میں ایک سفر میں تھا۔ دورانِ سفر ایک اخباری نمائندہ نے میرا انٹرویو لیا۔ اس میں اخباری نمائندہ نے ایک سوال یہ کیا کہ آپ کے بارے میں طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ آر ایس ایس کے آدمی ہیں۔ ان الزامات کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے الزامات صرف مجھ سے خاص نہیں ہیں۔ جب بھی کوئی آدمی کام کرنے کے لیے اٹھتا ہے تو لوگ اس کو اسی طرح اپنے الزامات کا شکار بناتے ہیں۔ مثلاً سرسید، اقبال، مولانا حسین احمد مدنی، ابوالکلام آزاد، مولانا علی میاں، وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی شخص اس قسم کے الزامات سے بچا ہوا نہیں، حتی کہ تبلیغی جماعت جو ایک بے ضرر جماعت ہے اس پر بھی بڑے بڑے الزامات لگائے گئے۔ مثلاً یہ کہ وہ سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں، وہ مسلمانوں کو عمل کے میدان سے ہٹانے کی سازش کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں میں غلط دین پھیلا رہے ہیں، وغیرہ۔

اس قسم کی بات کے بارے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ ان کو حقائق کی بنیاد پر جانچ کر دیکھا جائے۔ صرف کسی کے کہنے کی بنیاد پر رائے نہ قائم کی جائے۔ اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی دوسرے شخص کے بارے میں اگر ایسی خبر دے جس میں اس شخص پر کوئی الزام آتا ہو تو ایسی خبر کو محض سن کر مان لینا ایمانی احتیاط کے سراسر خلاف ہے۔ سننے والے پر لازم ہے کہ وہ ایسی خبر کی ضروری تحقیق کرے، اور جو رائے قائم کرے غیر جانب دارانہ تحقیق کے بعد کرے، نہ کہ تحقیق سے پہلے۔ یہ سخت غیر ذمہ داری کی بات ہے کہ کسی آدمی کے بارے میں بے تحقیق خبر پر کوئی رائے قائم کی جائے، یا کوئی اقدام کیا جائے۔

امیر معاویہ کا رول

معاویہ بن ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ہیں۔ وہ ہجرتِ مدینہ سے تقریباً 15 برس قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ جب اسلام لائے تو ان کی عمر پچیس سال تھی۔ وہ کاتبین وحی میں سے تھے۔ ان کے بارے میں رسول اللہ کی ایک دعائیہ روایت ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي عَمِيرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لِمُعَاوِيَةَ: اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3842)۔ یعنی عبدالرحمن بن ابوعمیرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کے بارے میں کہا: اے اللہ، تو اس کو ہدایت دینے والا بنا، اور اس کو ہدایت پر قائم رکھ، اور اس کے ذریعے سے ہدایت دے۔

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں امیر معاویہ کا ایک اہم رول ہے۔ وہ اہم رول کیا ہے۔ وہ اہم رول یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی تاریخ کو دوبارہ دورِ جاہلیت کی طرف جانے سے بچالیا۔ یعنی دورِ جاہلیت کی طرح ہونے والی آپسی خانہ جنگی سے امت مسلمہ کو بچایا۔

امیر معاویہ کے معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ امیر معاویہ نے پریکٹکل وزڈم استعمال کرتے ہوئے فیصلہ کیا۔ رسول اللہ کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ آپ کو کتاب دی گئی، اور حکمت (2:129)۔ حکمت سے مراد ہے پریکٹکل وزڈم۔ معاویہ نے اپنے زمانے میں یہی طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ ملوکیت کا طریقہ نہیں تھا۔ اسکالرشپ کی زبان میں اس طریقے کو ڈائناسٹی (dynasty) کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہی طریقہ قابلِ عمل تھا۔ چنانچہ اس کے بعد مسلم عہد میں ڈائناسٹی ہی کا طریقہ رائج رہا۔

رسول اللہ کے بعد جہاں بھی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی، ہر جگہ یہی طریقہ رائج رہا۔ اس کی وجہ سے مسلم عہد میں استحکام (stability) آ گیا۔ اسی سیاسی استحکام کی بنا پر بعد کے زمانے میں اسلام کے تمام کام انجام پائے۔

جدید ذہن اور اسلام

جدید ذہن (modern mind) کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کو یہ نظر آتا ہے کہ اسلام کا قدیم ماڈل دورِ جدید کے ماحول سے ٹکرا رہا ہے۔ اس بنا پر اسلام بظاہر دورِ جدید کے لیے غیر موزوں (misfit) ہو گیا ہے۔ مثلاً ان کے خیال کے مطابق، اسلام اپنے قانون کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، جب کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جمہوریت (government of the people) کے اصول پر چلائی جاتی ہیں۔

اسی طرح ان کا یہ خیال ہے کہ اسلام اظہارِ خیال کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتا ہے، جب کہ جدید ذہن اظہارِ خیال کی آزادی کو غیر مشروط حق سمجھتا ہے۔ اسلام میں اجتماعی زندگی کے لیے جو شرعی قوانین ہیں، ان کو اسلام مقدس اور ناقابلِ تغیر سمجھتا ہے، جب کہ موجودہ زمانے میں کسی قانون کو اس معنی میں مقدس نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام اپنے ماننے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی الگ شناخت (identity) قائم کریں، جب کہ اس قسم کا نظریہ جدید دور میں ایک اجنبی نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں قومیت (nationhood) کو مذہب پر مبنی قرار دیا گیا ہے، جب کہ دورِ جدید میں عام طور پر مبنی بر وطن قومیت (homeland-based nationality) کو تسلیم کر لیا گیا ہے، وغیرہ۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے تمام خیالات ایک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اور وہ ہے —— اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا۔ وہ تمام چیزیں جن کی صداقت پر موجودہ زمانے میں شک کیا جاتا ہے، وہ سب کی سب مسلم ذہن کی پیداوار ہیں، وہ اسلام کی اصل تعلیم کا حصہ نہیں۔

یہ تمام چیزیں وہ ہیں، جن کو بعد کے زمانے میں مسلمانوں نے بطور خود اضافہ کر کے اسلام کا نام دے دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ تمام چیزیں حاشیۂ کتاب (footnotes) کا حصہ ہیں، نہ کہ متنِ کتاب کا حصہ۔ مثال کے طور پر، شتمِ رسول پر قتل کی سزا بعد کو مسلم فقہا نے وضع کیا، قرآن وسنت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

عالمی دعوت کا نظام

موجودہ زمانے میں کمپیوٹر کے وجود میں آنے کے بعد سیمینار اور کانفرنس کے لیے ایک نیا عالمی سسٹم وجود میں آیا ہے۔ اس کو ویبنار (webinar) کہا جاتا ہے۔ کچھ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں، جو آپ کو ویبنار کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتی ہیں۔ مثلاً زوم، گوگل میٹ، میکروسافٹ ٹیم، وغیرہ۔ آپ ان پلیٹ فارم میں سے کسی کو سبسکرائب کیجیے۔ آپ کے لیے ملکی سطح پر یا عالمی سطح پر ویبنار کا انتظام ہوجائے گا۔ آپ کے مقررین کو پروگرام کے لیے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں، وہ اپنے مقام پر بیٹھ کر اس ویبینار کے ذریعے ساری دنیا کے آڈینس کو خطاب کر سکتے ہیں:

A webinar is a seminar or other presentation that takes place on the internet, allowing participants in different locations to see and hear the presenter, ask questions, and sometimes answer polls.

آئی ٹی انقلاب سے پہلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ کوئی سیمینار کیا جائے تو شرکت کرنے والے مہمانوں کو سفر کا خرچ دے کر، اور ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا انتظام کر کے بلایا جاتا تھا، پھر سیمینار یا کانفرنس منعقد کی جاتی تھی۔ اس میں بہت زیادہ پیسہ خرچ ہوتا تھا، اور سفر کی مشقت، دوسرے ٹاسک کی مشقت الگ تھی۔ مگر ویبنار کا نظام قائم ہوجانے کے بعد یہ سارے جھمیلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب کانفرنس کرنے والے کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ مقررین کو انوائٹ کریں کہ فلاں وقت ویبنار ہوگا۔ ان کو تاریخ، اور وقت اور لنک، وغیرہ دے دیا جاتا ہے، اور عام لوگوں کو سوشل میڈیا، وغیرہ کے ذریعے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ مقررہ وقت پر تمام لوگ متعین پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوتے ہیں، اور آن لائن میٹنگ یا سیمینار وغیرہ شروع ہوجاتا ہے۔

مثال کے طور پر سی پی ایس کی علما ٹیم انڈیا کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن وہ لوگ ہر دن صبح کے وقت سیمینار کی طرز پر آپس میں علمی ڈسکشن کرتے ہیں۔ یہ ڈسکشن آن لائن ہوتا ہے۔ یہ نظام گویا اس بات کا اعلان ہے کہ دعوت کے عالمی مشن کے لیے انفراسٹرکچر قائم ہو چکا ہے۔ اب امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو اویل کر کے ساری دنیا میں خدا کے مشن کو پہنچائے۔

آزادیِ رائے کا ماحول

ایک طریقہ وہ ہے، جس کو شخصی اجارہ داری کا طریقہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ بظاہر غیر نزاعی طریقہ ہوتا ہے۔ یعنی ایسا طریقہ جس میں مرکزی شخصیت کی بات مانی جائے، اس سے کوئی اختلاف نہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں آزادیِ رائے کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بات کو شخصیت کے بجائے میرٹ (merit) کی سطح پر دیکھا جائے، اور اس کو صحیح اور غلط کے معیار سے جانچا جائے۔ اس طریقے میں آزادیِ رائے کا ماحول باقی رہتا ہے۔ اس طریقے میں وہ لوگ اکٹھا ہوتے ہیں، جنھوں نے اپنے زمانے کو سمجھا ہو، اور اس کو اویل کیا ہو۔ پہلا طریقہ قدیم پیٹرن ہے، اور دوسرا طریقہ جدید پیٹرن۔

دونوں طریقے کے اپنے اپنے فائدے ہیں۔ پہلے طریقے میں بظاہر یہ فائدہ ہے کہ وہاں اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ وہاں کے افراد میں ذہنی ارتقا نہیں ہو پاتا، ان کے اندر فکری جمود (intellectual stagnation) پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ نئے نئے آئڈیاز پر سوچ نہیں پاتے۔ وہ کریٹیو تھنکنگ سے خالی ہوجاتے ہیں۔ ہر آدمی جہاں ہے، وہیں ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر باقی رہتا ہے۔ دوسرے طریقے میں بظاہر اختلاف کی برائی نظر آتی ہے۔ لیکن اختلاف کو اگر رائے کا فرق مان لیا جائے تو اس کی برائی ختم ہوجائے گی۔ ہر آدمی اپنی اپنی رائے کو لے کر سوچے گا۔ ہر آدمی کو یہ موقع رہے گا کہ وہ مختلف آرا کو ان کے میرٹ پر جانچے۔

آزادیِ رائے کے ماحول میں ذہنی ارتقا کا موقع باقی رہتا ہے۔ لیکن جہاں رائے کی آزادی کا ماحول نہ ہو، وہاں ذہنی جمود پیدا ہوجائے گا۔ جو شخص ذہنی طور پر جہاں پہلے تھا، وہیں باقی رہے گا۔ اس کے ذہنی ارتقا کا سفر رک جائے گا۔ انسانوں کے طرز فکر میں اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں۔ کیوں کہ اِس اختلاف کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ڈسکشن اور ڈائیلاگ ہوتا ہے، اور ڈسکشن اور ڈائیلاگ ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے۔ جہاں ڈسکشن اور ڈائیلاگ نہ ہو، وہاں یقینی طور پر ذہنی جمود پیدا ہوجائے گا، اور ذہنی جمود سے زیادہ تباہ کن اور کوئی چیز انسان کے لیے نہیں۔

امن اور انصاف

ایک تعلیم یافتہ کشمیری مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ امن ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی امن چاہتے ہیں، مگر امن وہ ہے جس کے ساتھ انصاف ملے، جس امن کے ساتھ انصاف شامل نہ ہو وہ تو صرف ظالموں کے لیے مفید ہے، نہ کہ مظلوموں کے لیے۔

کچھ لوگ امن مع انصاف (peace with justice) کی وکالت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ صرف امن ایک منفی امن (negative peace) ہے اور امن مع انصاف مثبت امن۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، جس میں تمام دنیا کے مسلم رہنما مبتلا ہیں۔ امن کی تعریف عدم جنگ (absence of war) سے کی جاتی ہے۔ یہ بالکل صحیح تعریف ہے۔ نتیجہ خیز امن وہ ہے جو امن برائے امن ہو۔ امن کے قیام کا مطلب انصاف کا نظام قائم کرنا نہیں ہے۔ امن صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تعمیری سرگرمیوں کے لیے کارگر فضا حاصل ہو سکے۔ یہی عقل کے مطابق بھی ہے اور یہی اسلام کے مطابق بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حدیبیہ کا امن معاہدہ کیا تو اس میں آپ کو صرف امن ملا تھا، انصاف نہیں ملا تھا۔ البتہ جب امن کے ذریعہ معتدل حالات پیدا ہوئے تو آپ نے ان حالات سے پیدا ہونے والے مواقع کو استعمال کر کے انصاف سے بھی عظیم کامیابی حاصل کر لی، یعنی مکہ کی فتح۔ انصاف کبھی امن کا جزء نہیں ہوتا، انصاف ہمیشہ امن کے بعد حاصل شدہ مواقع کو استعمال کرنے سے ملتا ہے، نہ کہ براہ راست طور پر خود امن کے ساتھ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عملی اعتبار سے امن تمام مطلوب چیزوں میں سب سے بڑا مطلوب ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی مثبت یا تعمیری کام کے لیے انسانی آبادی میں امن کا ماحول انتہائی ضروری ہے۔ امن کے بغیر کسی بھی قسم کی کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ امن معتدل ماحول میں فکر و عمل کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس سے لوگوں کے درمیان مثبت سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ امن سے سماج میں تعمیری سرگرمیوں کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، متشددانہ ماحول سماج میں نفرت، مایوسی اور غیر یقینی صورت حال کی منفی فضا قائم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امن کے ساتھ آپ ابدی طور پر رہ سکتے ہیں مگر تشدد کے ماحول میں آپ ابدی طور پر نہیں رہ سکتے۔

نیا زمانہ، نئی پلاننگ

اسلام میں عقیدہ مطلق (absolute) ہے، لیکن منہاج (method) ہمیشہ قابل تبدیلی (changeable) ہوتا ہے۔ مثلاً توحید کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، لیکن سواری کا تعلق منہاج سے ہے۔ قدیم زمانہ میں حج کا سفر اونٹ کے ذریعہ ہوتا تھا، اب زمانہ کی تبدیلی کی بنا پر حاجی لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ، خاص طور پر بیسویں صدی میں اسلامی احیاء یا اسلامی انقلاب کے لیے بہت زیادہ تحریکیں اٹھائی گئیں۔ لیکن سب کی سب اپنے نشانہ کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوئیں۔ اس کا مشترک سبب یہ تھا کہ دنیا میں ہر اعتبار سے ایک نیا دور (new age) آچکا تھا۔ مگر مسلم رہنما نئی تبدیلیوں سے مکمل طور پر بے خبر رہے۔ ان رہنماؤں کا مشترک کیس ایک رہنما کے اپنے الفاظ کے مطابق یہ تھا:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اصل یہ ہے کہ فرد یا سماج کی ترقی کا راز زمانی تبدیلی کو سمجھنے اور اس کے مطابق پلاننگ کرنے میں چھپا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں جدید سائنس کے ظہور کے بعد پوری صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ اس دور میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ تھا کہ نئے زمانے کو دریافت کرکے اس کے مطابق بذریعہ اجتہاد اسلام کی تطبیقِ نو (reapplication) تلاش کی جائے۔ مگر مسلم رہنما ایسا نہ کرسکے۔ یہ رہنما ایسے منہاج کے مطابق اپنی تحریکیں چلاتے رہے، جو زمانی تبدیلی کی بنا پر اب ناقابلِ عمل (obsolete) ہو چکے تھے۔ اس بنا پر ان کے منصوبے بھی عملاً ناقابلِ تطبیق (inapplicable) ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تحریکوں نے ملی خدمات کے نام پر کچھ پُرشور ہنگامے تو ضرور جاری کیے، لیکن وہ ملت کے لیے کوئی نتیجہ خیز تعمیری عمل انجام نہ دے سکے۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف اول کی خلافت تحریک کو لیجیے، جو مسلم رہنماؤں نے نہایت زور وشور کے ساتھ چلائی، لیکن وہ مکمل طور پر بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ترکی کی

خلافت جو بشمول ترکی 23 ملکوں میں قائم تھی، اس کا جواز قدیم طرز کے ایمپائر سے حاصل ہوا تھا۔ انیسویں صدی میں یہ سیاسی ماڈل عملاً متروک قرار پا گیا۔ اب اس کی جگہ نیا پولیٹکل ماڈل قائم ہوا، جو نیشن اسٹیٹ (nation state) کے تصور پر قائم تھا۔ اب ساری دنیا میں وطن پر مبنی قومیت (homeland based nationalism) رائج ہے۔ ایسے پولیٹکل ماحول میں خلافت عملاً بے زمین (groundless) ہو چکی ہے۔ یہ واقعہ خود عرب ملکوں میں پیش آیا، جو اس وقت خلافت عثمانی کا حصہ تھے۔ 1924 میں اتاترک نے سیاسی خلافت کو نہیں ختم کیا، بلکہ وہ اس سے پہلے نئے سیاسی ماڈل کی بنا پر عملاً ختم ہو چکی تھی۔

زمانہ کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلم رہنما اپنی تحریکوں کا نقشہ نئے انداز میں بنائیں، جو زمانے کے تقاضہ کے مطابق ہو۔ مگر انھوں نے ایسی تحریکیں چلائیں جو خلافِ زمانہ حرکت (anachronism) کا مصداق تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم رہنماؤں کی تمام تر کوششوں کے باوجود تحریکِ خلافت اپنا نشانہ حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔

اسی طرح ایک اور مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے کچھ رہنماؤں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے پرتشدد طریقِ کار (violent activism) کو اختیار کیا، اور ان تحریکوں کو بطور خود جہاد کا نام دے دیا۔ یہ تحریکیں بھی اپنے نشانے کو پانے میں مکمل طور پر ناکام ہوگئیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دو عالمی جنگوں کے تجربے کے بعد ساری دنیا میں وائلنٹ ایکٹوزم (violent activism) ناقابلِ عمل قرار پا چکا تھا۔ اب جو طریقِ کار جائز طریقہ کی حیثیت سے دنیا میں مقبول ہوا، وہ مبنی بر امن طریقہ (peaceful activism) تھا۔

اقوام متحدہ کا عالمی نظام پر امن طریقِ کار کو جائز طریقِ کار (justified activism) کی حیثیت دیتا تھا، اور اس کے مقابلے میں پرتشدد طریقِ کار کو مکمل طور پر رد کر رہا تھا، لیکن مسلم رہنما زمانہ کی اس تبدیلی سے بے خبر ہو کر قدیم روایت کے مطابق پرتشدد طریق کار کے مطابق اپنی تحریکیں چلاتے رہے۔ انھوں نے اس بین اقوامی راز کو نہیں سمجھا کہ کوئی طریقِ کار جہاد کا عنوان دینے سے

قابلِ عمل نہیں بنتا، بلکہ یہ ایک سیکولر سبجکٹ ہے جو مروجہ یونیورسل نارم (universal norm) کے تحت تشکیل پاتا ہے، اور اسی بنیاد پر اس کو سند جواز ملتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں قومیت (nationhood) کا تصور ایک سیکولر تصور ہے۔ قومیت کا تعین سیکولر نظریات کے تحت متعین ہوتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے خود ساختہ ذہن کے تحت قومیت کے تصور کو اسلامائز کرنا شروع کر دیا، جو کہ موجودہ زمانے میں پوری طرح ناقابلِ عمل ہو چکا تھا۔

موجودہ زمانے میں قومیت کا تعلق وطن (homeland) سے تھا، مگر مسلم رہنماؤں نے اپنی بے خبری کے تحت مسلمانوں کو یہ بتایا کہ مسلمان کی قومیت اسلام پر مبنی ہونی چاہیے، نہ کہ وطن پر۔ یہ نظریہ بلاشبہ حقیقت پسندی کے خلاف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے بارے میں ساری دنیا میں یہ تصور بن گیا کہ مسلمان اپنے مذہب کا وفادار ہوتا ہے، وہ اپنے وطن کا وفادار نہیں ہوتا۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوا کہ مسلمان عملاً ڈبل اسٹینڈرڈ کے خطرے میں مبتلا ہو گئے۔ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جاتے ہیں، اور بظاہر وہ اس ملک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر ان کا مائنڈ سیٹ (mindset) وہی باقی رہتا ہے، جو کہ پہلے تھا۔ اس طرح وہ اپنے کو اس خطرے میں ڈال لیتے ہیں کہ وہ خود تو اپنے کو مومن سمجھیں، لیکن فرشتوں کے ریکارڈ میں ان کو ڈبل اسٹینڈرڈ والی شخصیت لکھا جائے۔

ترقی کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ آپ اپنے مذہب سے باخبر ہوں، بلکہ ترقی کا تعلق اس سے ہے کہ آپ زمانے کے تقاضے کو سمجھیں، اور اس کے مطابق اپنے دین اور دنیا کی منصوبہ بندی کریں۔ تبدیل شدہ حالات کو سمجھنا، اور اس کی رعایت کرنا، منصوبہ بندی کو کامیاب کرتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسان کھلے ذہن کے ساتھ موجودہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور بغیر کسی ریزرویشن کے اس کے مطابق اپنے عمل کی پلاننگ کرے۔ لیکن موجودہ دور کے مسلمان اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ یہ دور سائنسی دریافتوں کی بنا پر قدیم دور سے بالکل الگ حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ جدید تقاضوں کو سمجھیں، اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔

قوم کی ترقی

موجودہ دنیا کی زندگی خالق کی طرف سے دی ہوئی فطری آزادی پر قائم ہے۔ ہر انسان خالق کی طرف سے آزاد پیدا کیا جاتا ہے، اور وہ دنیا میں جو زندگی گزارتا ہے، وہ سب آزادی کے فطری اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ یہاں ہر انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے، وہ چاہے مصلح بن کر رہے یا مفسد بن کر رہے۔ آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر دنیا میں کبھی معیاری حالات نہیں ہو سکتے۔ ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے، جو کچھ لوگوں کے لیے ناخوشگوار ثابت ہوں، اور کچھ لوگوں کے لیے ایسے ثابت ہوں، جن کو وہ ظلم کہہ کر شکایت کلچر میں مبتلا ہو جائیں۔

مگر یہ صرف انسان کی آزادی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کی ترقی کے لیے خالق کا مقرر کردہ کورس ہے۔ انھیں واقعات کی بنا پر دنیا میں جدوجہد اور چیلنج کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ اس ماحول کی بنا پر انسان کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ انسان کے ذہن کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔ ان غیر معمولی حالات میں انسان ایسے کارنامے انجام دیتا ہے، جن کو وہ معمول کے حالات میں انجام نہیں دے سکتا تھا۔

یہ خالق کی منصوبہ بندی (planning) کا معاملہ ہے۔ یہ سب جو ہوتا ہے، وہ خود خالق کے بنائے ہوئے نظام کی بنا پر ہوتا ہے، نہ کہ کسی کے ظلم کی بنا پر۔ اسی لیے ایسے واقعات ہر ایک کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ حتی کے پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ بھی۔

اس طرح کے واقعات کو قرآن میں مصیبت کہا گیا ہے (2:156)۔ مذکورہ آیت کے مطابق، ناخوشگوار واقعات کے مقابلے میں فطری رسپانس یہ ہے کہ لوگ اس پر صبر کرتے ہوئے، نئے نئے راستے تلاش کریں۔ وہ نئے نئے واقعے دریافت کر کے ان کو اویل کرنے کی منصوبہ بندی کریں۔ ایسے واقعات انسان کی ترقی کے لیے ہوتے ہیں، نہ کہ ان کی دشمنی کے لیے۔ کسی مفکر نے درست طور پر کہا ہے کہ یہ زندگی کی مشکلیں ہیں، جو انسان کو انسان بناتی ہیں:

> It is not ease, but effort, not facility, but difficulty that makes men. (Samuel Smiles)

قصور اپنا نکل آیا

نوجوانی کی عمر میں مَیں نے ایک اردو ماہنامے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: قصور اپنا نکل آیا۔ یہ عنوان معروف اردو شاعر مومن خاں مومن (1852-1800) کے ایک شعر سے لیا گیا تھا، جس کا پورا مصرعہ اس طرح ہے:

میں الزام اس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں مضمون نگار نے بتایا تھا کہ انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ دوسروں کو الزام دیتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کو جو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے، وہ کہیں نہ کہیں خود اپنی غلطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان یہ کرتا ہے کہ واقعات کی ترتیب ایسے انداز سے کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح غلطی دوسرے کی ثابت ہوجائے اور وہ آدمی خود اپنی غلطی سے بچا رہے۔

سماجی زندگی میں کوئی واقعہ منفرد طور پر انجام نہیں پاتا، بلکہ ہر واقعہ مختلف اسباب کا مجموعی نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان یہ کرتا ہے اسباب کی موافق کڑیوں کو لیتا ہے، اور بظاہر اپنے خلاف نظر آنے والی کڑیوں کو حذف کر دیتا ہے۔ وہ واقعے کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ نتیجہ اپنے حسب حال دکھائی دینے لگے۔ یہ غلطی افراد بھی کرتے ہیں، اور قومیں بھی۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر غلطی کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے سماجی زندگی میں ہمیشہ شکایت اور ٹکراؤ کے حالات باقی رہتے ہیں— غلطی کی اصلاح کا آغاز اپنے آپ سے کیجیے، اور پھر ہر مسئلہ اس طرح حل ہوجائے گا، جیسے کہ وہ تھا ہی نہیں۔

اپنی نوجوانی کے زمانے میں مَیں سفر کیا کرتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہر آدمی دوسرے کی شکایت کر رہا ہے، ہر آدمی کسی نہ کسی کے ظلم کو بیان کر رہا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ جب ہر آدمی مظلوم ہے تو وہ شخص کہاں ہے، جو ظالم کا رول ادا کر رہا ہے۔ بہت دن کے بعد میں نے دریافت کیا کہ اصل بات یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی غلطی کو دوسرے کے اوپر ڈال رہا ہے۔ کوئی شخص خود اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ یہی تمام مسائل کا سبب ہے۔ اس تجربے کے بعد میرا یہ مزاج بن گیا کہ میں کبھی کسی دوسرے کو الزام ہی نہیں دیتا، ہمیشہ ہر غلطی کا الزام اپنے آپ پر دیتا ہوں، حتّٰی کہ ایسی غلطی بھی جو بظاہر میری نہیں ہوتی۔ کیوں کہ غلطی کا الزام دوسرے کو دینا مجھ کو غیر فطری کام معلوم ہوتا ہے۔

کوالیٹی کی اہمیت

فارسی زبان کا ایک ضرب المثل ہے — جو شمشیر زنی کرتا ہے، اُسی کا سکہ چلتا ہے:

ہر کہ شمشیر زند، سکّہ بنامش خوانند

یہ مثل قدیم زمانے کا مثل ہے، جب کہ دنیا میں فیصلے کی بنیاد جنگ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب سائنس کا زمانہ ہے۔ اب دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت اعلیٰ کوالیٹی (quality) کی ہوگئی ہے۔ اب انھیں لوگوں کی اہمیت ہے، جن کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے اعلیٰ کوالیٹی کا پروڈکٹ ہو — کوالیٹی ایجوکیشن، کوالیٹی انڈسٹری، کوالیٹی علاج، کوالیٹی مینجمنٹ، کوالیٹی سپلائی، کوالیٹی بیہیویر، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اعلیٰ کوالیٹی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ آپ خواہ جس شعبے میں ہوں، اگر آپ اعلیٰ کوالیٹی کا ثبوت دیں، تو یقینی طور پر آپ کامیاب رہیں گے۔

موجودہ زمانے میں آپ کو حقوق طلبی کی مہم چلانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو نہ ظلم اور سازش پر احتجاج کرنا ہے، اور نہ رائٹ ایکٹوزم کی مہم چلانا ہے۔ آج کی دنیا ایک کھلا بازار ہے۔ آپ کسی بھی شعبہ میں لوگوں کو اعلیٰ کوالیٹی کا ریزلٹ دینا شروع کر دیں، تو آپ کی کامیابی اتنی زیادہ یقینی ہو جائے گی کہ جس کو کوئی چیلنج نہ کر سکے۔ مجھے ایک شخص کا قصہ معلوم ہے، وہ یوپی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ پھر وہ گھر کے حالات سے تنگ آ کر بمبئی چلا گیا۔ بمبئی میں اس نے معمولی مزدور کی حیثیت سے گھروں کی پینٹنگ کا کام شروع کیا۔ دھیرے دھیرے اس کا کام اتنا زیادہ بڑھا کہ پورے بمبئی میں پھیل گیا۔ اس کی کامیابی کا راز صرف ایک تھا، اور وہ ہے اعلیٰ کوالیٹی پینٹنگ۔

موجودہ زمانے میں اعلیٰ کوالیٹی کامیابی کا واحد راز ہے۔ ناخن کٹر (nail cutter) سے لے کر کار تک، ہر چیز میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اعلیٰ کوالیٹی کا پروڈکٹ دیں۔ مثلاً آپ کی ڈیلنگ اعلیٰ کوالیٹی کی ڈیلنگ ہو۔ آپ کا کردار ہر معاملے میں قابلِ پیشین گوئی کردار (predictable character) ہو۔

لفظ اور معنی

قدیم عرب میں بہت سے بُت تھے۔ ایک بڑے بت کا نام "منات" تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عرب کا "منات" اور ہندستان کا "سومنات" دونوں ایک ہی دیوتا کے دو نام ہیں۔ حالانکہ صوتی مناسبت کے سوا اس نظریہ کے حق میں کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں۔

اسی طرح بعض عرب سیاح جب ہندستان آئے اور انھوں نے یہاں "برھما" کا لفظ سنا تو انھوں نے یہ خیال قائم کرلیا کہ برھما اور ابراہیم دونوں کی اصل ایک ہے، اور ہندستان کے برہمن "ابراہیم" کی اولاد ہیں۔ علامہ شہرستانی نے اس مسئلہ پر لکھا ہے کہ یہ محض ایک خیالی بات ہے (من الناس من يظن أنهم سموا براهمة لا نتسابهم إلى إبراهيم عليه السلام وذلك خطأ)، اس کے حق میں تاریخی شواہد موجود نہیں۔ (الملل والنحل للشہرستانی، جلد 3، صفحہ 95)

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق علم سے یا علمی استدلال سے نہیں۔ یہ شاعری کی اس صنف کو تاریخ میں استعمال کرنے کی کوشش ہے جس کو "مناسبتِ لفظی" کہا جاتا ہے۔

مناسبتِ لفظی کا یہ طریقہ صرف لطیفہ گو لوگوں کے یہاں رائج نہیں۔ بہت سے لوگ حقیقی معاملات میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کوئی شخص ایک مذہبی نظریہ گھڑتا ہے اور اس کے حق میں اس قسم کی لفظی دلیل دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی بات کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔ کوئی شخص ایک سیاسی پروگرام بناتا ہے اور اس پر پوری ایک قوم کو دوڑا دیتا ہے۔ حالاں کہ اس سیاسی پروگرام کے حق میں ایک لفظی نکتہ کے سوا کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں ہوتی۔

الفاظ کے مجموعہ سے معنوی حقائق برآمد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اس قسم کی تحریکوں اور اس قسم کے ہنگاموں کا کوئی حقیقی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اور نہ اب تک ان کا کوئی نتیجہ نکلا ہے۔ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ لفظی نکتوں اور معنوی حقیقتوں میں فرق کرے۔ وہ لفظی نکتوں کی بنیاد پر کوئی پروگرام نہ بنائے۔ بلکہ حقائق کی بنیاد پر غور وفکر کے بعد اپنا پروگرام ترتیب دے۔ حقیقی کلام وہ ہے جو مناسبتِ معنوی پر مبنی ہو، نہ کہ مناسبتِ لفظی پر۔ نتیجہ خیز عمل وہ ہے جو حقائق کی بنیاد پر انجام دیا جائے، نہ کہ تخیلات کی بنیاد پر۔

زمین اپنے خاتمہ کی طرف

انڈیا کے معروف انگریزی روزنامہ، ٹائمس آف انڈیا (17 جون 2023) نئی دہلی ایڈیشن کے ٹائمس گلوبل کے صفحہ پر ایک نیوز کا عنوان یہ تھا:

Heatwaves, wildfires hit globe; Asia, Europe, US sizzle at 40°C+

یعنی ہیٹ ویو اور جنگل کی آگ نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے تحت جو خبر دی گئی تھی وہ ایک انسان کو سنجیدہ غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ خبر کے مطابق، ایشیا، یورپ اور امریکہ میں درجہ حرارت 40 ڈگری سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اتوار کے روز شدید گرمی نے تین براعظم، ایشیا، یورپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جنگلی آگ (wildfires) کے بڑھتے واقعات اور انتہائی شدت کے درجۂ حرارت اُس سنگین خطرہ کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ گلوبل وارمنگ میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ماہرین موسمیات کی جانب سے مستقبل کے لیے انتہائی شدید گرمی کی پیش گوئیاں کی جارہی ہیں۔

چین نے درجہ حرارت کے حوالے سے متعدد الرٹ جاری کیے ہیں، جن میں سنکیانگ کے صحرائی علاقے میں درجہ حرارت 40 سے 45 ڈگری سینٹی گریڈ اور جنوبی گوانگسی خطے میں 39 ڈگری سینٹی گریڈ رہنے کی وارننگ دی گئی ہے۔ امریکہ کی نیشنل ویدر سروس نے بتایا ہے کہ کیلیفورنیا سے ٹیکساس تک شدید گرمی اور ہیٹ ویو اپنے عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ کیلیفورنیا کی ڈیتھ ویلی سیارۂ زمین کے گرم ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ ماہرین موسمیات کے اندازے کے مطابق، یہاں بھی درجہ حرارت ممکنہ طور پر 54 ڈگری سینٹی گریڈ سے تجاوز کرجائے گا۔ جنوبی کیلی فورنیا کے کئی جنگلات میں لگی آگ سے نمٹا جارہا ہے۔

کینیڈا میں اس سال جنگل کی آگ نے ایک کروڑ ہیکٹر رقبے کو جلا دیا ہے۔ اٹلی کے بارے میں اندازہ یہ ہے کہ درجہ حرارت 43 ڈگری سینٹی گریڈ یا اس سے زیادہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہاں کی وزارتِ صحت نے 16 شہروں کے لیے ریڈ الرٹ جاری کیا ہے۔ یونان میں واقع تاریخی قلعہ ایکروپولیس (Acropolis of Athens) سیاحوں کے لیے انتہائی پرکشش حیثیت رکھتا ہے۔ جولائی 2023 میں گرمی کی زیادتی کی وجہ سے یونانی حکومت نے کئی دنوں تک اس کو بند رکھا۔"

اسی قسم کے ناقابلِ برداشت، انتہائی شدید گرمی کے تجربہ سے 2024 میں برصغیر ہندو پاک اور دیگر

خطے کے لوگ بھی گزر رہے ہیں۔ انڈیا ٹوڈے کی رپورٹ (30 مئی 2024) کے مطابق، مئی 2024 میں نئی دہلی میں سال کا گرم ترین دن ریکارڈ کیا گیا تھا، یعنی 52°C۔ انڈیا کے 37 شہروں کا درجہ حرارت 45°C سے زیادہ ہو چکا ہے۔ نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس (AP) کی رپورٹ (24 مئی 2024) کے مطابق، پاکستان کے علاقہ موہنجوڈارو میں مئی کے مہینہ میں 49°C تک پہنچا تھا۔ اور جون کے مہینہ میں 55°C درجہ حرارت پہنچنے کا امکان ہے۔ درجۂ حرارت کی زیادتی کی بنا پر سیارۂ زمین پر انسان کا رہنا دن بدن مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ بتدریج گلوبل بوائلنگ کا ظاہرہ بنتا جارہا ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انٹونیو گوٹیرش نے ماحولیات کی ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ گلوبل وارمنگ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، اب گلوبل بوائلنگ کا زمانہ آ گیا ہے:

The era of "global warming" has ended, and the era of "global boiling" has arrived. (https://rb.gy/wfm2vq)

جب میں نے ان وحشت ناک خبروں کو پڑھا تو مجھے قرآن کی یہ دو آیتیں یاد آئیں: جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔ اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک بنجر میدان بنا دیں گے (18:7-8)۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ "زمین کی دل فریبیاں انتہائی عارضی ہیں۔ وہ امتحان کی ایک مقرر مدت تک ہیں۔ اس کے بعد زمین کی یہ حیثیت ختم کر دی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ صحرا کی طرح بس ایک خشک میدان ہو کر رہ جائے گی۔" (تذکیر القرآن، صفحہ 773)

موسمیاتی تبدیلی اور گلوبل وارمنگ کے پس منظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ انسان مقصدِ حیات کے تعلق سے اپنی سوچ کو بدلے۔ کیوں کہ موسمیاتی تبدیلی کو بدلنا انسان کے بس میں نہیں ہے، انسان کے بس میں یہ ہے کہ وہ زمین پر زندگی گزارنے کے اپنے زاویۂ نظر کو تبدیل کرے۔ یعنی یہ کہ سیارۂ زمین پر موجود سامانِ حیات انٹرٹینمنٹ کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ خدا کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق اگلے مرحلۂ حیات کی تیاری کا مقام ہے۔ گلوبل وارمنگ گویا خاموش زبان میں خدائی اعلان ہے کہ انسان کے تعلق سے زمین کا رول بتدریج اپنے خاتمہ کی طرف جارہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دانش مندی نہیں ہے کہ انسان اللہ رب العالمین اور اس کے کریشن پلان سے غافل ہو کر زندگی گزارے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم، نئی دہلی)

آئڈیالوجی نہ کہ تلوار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دعوت کا کام شروع کیا تو قریش کے لوگوں نے مختلف طریقوں سے آپ کو روکنے کی کوشش کی۔ ان میں ایک واقعہ وہ ہے جو سیرت کی کتابوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک بار قریش کے سردار ابوطالب کے یہاں جمع ہوئے۔ ابوطالب کے ذریعہ ان لوگوں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں، آپ نے کہا: كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تُعْطُونِيهَا تَمْلِكُونَ بِهَا الْعَرَبَ، وَتَدِينُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 417)۔ یعنی، میں صرف ایک کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔

بعض لوگوں نے رسول اللہ کے اس قول کا مطلب اسلامی حکومت کا قیام نکالا ہے۔ حالانکہ اس حدیث کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حدیث میں کلمہ کی بات کہی گئی ہے، نہ کہ حکومت کی۔ یہاں کلمہ کا مطلب وہی ہے جس کو آج کل کی زبان میں آئڈیالوجی (ideology) کہا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فوجی طاقت کے مقابلے میں، نظریے کی طاقت زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ اِس حقیقت کی ایک ممتاز مثال ہے۔ اسلام کو مستحکم کامیابی ہمیشہ آئڈیالوجی کی بنیاد پر حاصل ہوئی ہے، نہ کہ تلوار یا فوجی طاقت کی بنیاد پر۔

مثال کے طور پر مدینہ کو اسلام کی تاریخ میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ مدینہ کے اسلام کا دعوتی مرکز بننے کی وجہ اسلام کی آئڈیالوجی ہے۔ مدینہ کے انصار جب رسول اللہ سے ملے اور آپ کی دعوت کو سنا تو ان کو آپ کی بات پسند آ گئی۔ چنانچہ وہ لوگ آپ کے سچے ساتھی بن گئے۔ اس طرح مکہ کے بجائے مدینہ اسلامی مشن کا مرکز قرار پایا، اور ساری دنیا میں اسلام کا پیغام مدینہ کے ذریعہ پہنچا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جب آپ مدینہ آ گئے تو مکہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف جنگ کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ مثلاً، بدر، احد اور خندق وغیرہ۔ رسول اللہ نے اس جنگی سلسلے کو روکنے کے لیے حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ قریش سے یک طرفہ طور پر جھک کر دس سالہ ناجنگ معاہدہ کیا تھا۔

اسلامی تاریخ میں اس معاہدہ کو صلح حدیبیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صلح کے دو سال بعد بغیر کسی جنگ کے مکہ پر فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کی جڑ میں اسلام کی آئڈیالوجی تھی۔ ابن شہاب زہری تابعی کے مطابق، صلح حدیبیہ سے پہلے آپس کی لڑائی کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے۔ اب جب امن قائم ہوا، منافرت اور کشیدگی دور ہوئی تو آپس میں تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ اس طرح لوگوں کو اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کے بعد دو سالوں میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ بعثت سے لے کر اس وقت تک اتنے مسلمان نہیں ہوئے تھے (الْتَقَوْا فَتَفَاوَضُوا فِي الْحَدِيثِ وَالْمُنَازَعَةِ، فَلَمْ يُكَلِّمْ أَحَدٌ بِالْإِسْلَامِ يَعْقِلُ شَيْئًا إِلَّا دَخَلَ فِيهِ، وَلَقَدْ دَخَلَ فِي تِينِكَ السَّنَتَيْنِ مِثْلُ مَنْ كَانَ فِي الْإِسْلَامِ قَبْلَ ذَلِكَ أَوْ أَكْثَرَ) سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 322۔

اس قسم کا ایک عظیم واقعہ تیرھویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ تاتاری قبائل کے حملے نے عباسی سلطنت کو مغلوب کرلیا تھا۔ یہ غلبہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت اس کے مقابلے میں غیر موثر ثابت ہوئی۔ مورخ ابن اثیر نے اس زمانے کے مسلمانوں کے عمومی سوچ کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: اگر کوئی یہ بیان کرے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی اور قید کر لیے گئے تو اس کی بات پر یقین نہ کرنا، اور اگر کوئی تم سے یہ بیان کرے کہ تاتاریوں نے دوسروں کو قتل کر دیا ہے تو یقین کر لینا: مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوا وَأُسِرُوا فَلَا تُصَدِّقُوهُ وَإِذَا حُدِّثْتُمْ أَنَّهُمْ قَتَلُوا فَصَدِّقُوهُ (الکامل فی التاریخ، جلد 10، صفحہ 353)۔ ایسے نازک موقع پر اسلام کی نظریاتی طاقت ابھری۔ اور صرف نصف صدی کے اندر یہ واقعہ پیش آیا کہ تاتاری قبائل کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن، اسلام کے دوست بن گئے۔ اسلام کی اِس نظریاتی طاقت کو فلپ ہٹی (Philip K. Hitti) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے— مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی، جہاں اُن کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے:

The religion of Muslims has conquered, where their arms had failed. (*History of the Arabs*, 1970, p. 488)

حقیقت یہ ہے کہ آئڈیالوجی انسان کے دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور جب انسان کا دل مسخر ہو جائے تو کوئی اور چیز تسخیر کے لیے باقی نہیں رہتی۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 151-146)

146

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کیا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی۔ مگر کچھ لوگوں نے اس کام سے پرہیز کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے خطبہ دیا۔ آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اللہ کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 6101؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2356)

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی رہنمائی کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی بھی زمانے میں اہل ایمان کے لیے کوئی دوسرا معیار اختیار کرنا درست نہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے ریفرنس میں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ "بطور عقیدہ ہم مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے نمونہ ہیں۔ مگر جب مسلم ملت کے مسائل پر بات ہوتی ہے تو ہر آدمی خود اپنی عقل سے بولنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں کرتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور آپ کی سیرت میں اس کا جواب تلاش کرے۔ حالانکہ ایسی روش ہمارے ایمان کے مطابق نہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح دورِ اول کے لیے نمونہ تھے، اسی طرح عصر حاضر میں بھی آپ کی زندگی میں ہمارے لیے کامل رہنمائی موجود ہے۔" (دیکھیے، اسفار ہند، صفحہ 66-65)

147

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے اور وہاں لوگ کھجور کے درختوں میں تأبیر کا عمل کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا

کہ ہم اس کی تأبیر (pollination) کررہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید تمھارے لیے بہتر ہو۔ پس لوگوں نے اس عمل کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد پھل کم آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کا ذکر آپ سے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو تم اس کو لے لو۔ اور جب میں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں ایک انسان ہوں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2362)

تشریح: صحیح مسلم کی ایک اور روایت (حدیث نمبر 2363) میں یہ الفاظ ہیں: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (تم اپنی دنیا کے بارے میں زیادہ جانتے ہو)۔ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مکہ سے تھا جہاں اس وقت کھجور کے درخت نہیں ہوتے تھے۔ آپ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو یہاں کھجور کے باغات تھے اور قاعدے کے مطابق وہاں کے لوگ ان کو زرخیز کرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے تأبیر (pollination) کا عمل کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ غیر مانوس چیز تھی۔ چنانچہ آپ نے اس سے منع فرمایا۔ یہ بات اصول باغبانی کے خلاف تھی۔ اس لیے پیداوار میں کمی ہوگئی۔ تأبیر کا معاملہ ایک سیکولر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِسی طرح ٹکنالوجی یا سائنس کی دوسری دریافتیں بھی سیکولر شعبے سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں۔ اِس طرح کے معاملات میں سائنٹفک ریسرچ کا لحاظ کیا جائے گا۔

"تم اپنی دنیا کے بارے میں زیادہ جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ ایک پیغمبر اللہ کی ہدایت کو بتانے کے لیے آتا ہے۔ باغبانی اور زراعت اور انجینئرنگ جیسے موضوعات کی تعلیم کے لیے نہیں آتا۔ پیغمبر اسلام کے بعد اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زندگی کی نجات کا طریقہ خدا کے کلام اور میری سنت سے معلوم کرو اور مادی علوم کو اپنے تجربات ومشاہدات اور سائنٹفک ریسرچ کے تابع رکھو۔

148

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اور مجھ کو جو (ہدایت) دے کر اللہ نے بھیجا ہے اس کی مثال اس آدمی کی مانند ہے جو ایک قوم کے پاس آیا۔ اور کہا

کہ اے میری قوم کے لوگو، میں نے ایک لشکر کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور (اس خطرہ کے بارے) میں کُھلا وارننگ دینے والا ہوں۔ پس تم لوگ اپنی حفاظت کرو، خود اپنی حفاظت کرو۔ چنانچہ قوم کے کچھ لوگوں نے اس کی بات پر یقین کیا۔ وہ اندھیرے میں گھروں سے نکل کر (محفوظ جگہوں پر) چلے گئے۔ پس انھوں نے اپنے آپ کو بچالیا۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو جھٹلایا۔ اور اپنے گھروں میں ٹھہرے رہے۔ چنانچہ صبح صبح دشمن کے لشکر نے ان پر حملہ کر دیا اور انھیں ہلاک کر کے ان کو نیست و نابود کر دیا۔ یہی مثال ہے اس کی جس نے میری بات مان کر میری لائی ہوئی شریعت کی پیروی کی اور اس کی جس نے میری نافرمانی کی اور میری لائی ہوئی شریعت کا انکار کیا۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 7283؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2283)

تشریح: اس حدیث میں زندگی کی حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ ہر انسان جو زندہ ہے وہ ایک دن مرنے والا ہے اور اس کے بعد اس کو اپنے رب کے سامنے حساب و کتاب کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ یہ ایک انتہائی سنگین خطرہ ہے جس سے ہر انسان دو چار ہے۔ پیغمبر اسی لیے آتا ہے کہ وہ اس سنگین خطرہ سے انسان کو آگاہ کرے۔ پیغمبر اسلام کے بعد امتِ مسلمہ کی بھی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ نسل در نسل ہر زمانے کے لوگوں کو اس سنگین مسئلہ سے آگاہ کرتی رہے۔ اس ذمہ داری کی انجام دہی کے بغیر مسلمانوں کا امتِ محمدی ہونا مشتبہ ہے۔ اسی عمل کا نام دعوت الی اللہ ہے۔

149

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اس شخص کی مانند ہے جس نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اپنے اردگرد کا ماحول روشن کر دیا۔ تو پروانے اور پتنگے جو آگ میں گرا کرتے ہیں، اس میں گرنے لگے۔ اور وہ ان کو روکنے لگا۔ مگر وہ اس پر غالب آرہے ہیں اور آگ میں گرتے جارہے ہیں۔ اسی طرح میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں۔ اور تم لوگ اس میں گرتے جارہے ہو۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ مگر اس کے آخر میں آپ نے فرمایا: میری اور تمھاری مثال ایسی ہے کہ میں تمھیں کمر سے پکڑ کر

آگ سے بچا رہا ہوں۔ آگ سے نکل آؤ۔ مگر تم مجھ پر غالب آئے جاتے ہو اور اس میں گرتے جا رہے ہو۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 6483؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2284)

تشریح: دنیا کی رونقیں اور لذتیں امتحان کے لیے ہیں۔ دعوت اصلاً ایک نظریاتی جدوجہد (ideological struggle) ہے۔ دعوت کا اصل نشانہ فریقِ ثانی کی سوچ کو بدلنا ہوتا ہے۔ پیغمبر یا پیغمبر کی نیابت میں داعی لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا کے فریب سے اپنے آپ کو بچاؤ اور آخرت کی تیاری کرو۔ یعنی خالق کے بتائے ہوئے تخلیقی نقشہ کے مطابق زندگی گزارو۔ کامیاب وہ ہے جو اس سے متنبہ ہو کر آخرت کے لیے عمل کرے اور ناکام وہ ہے جو اس انتباہ کو نظر انداز کر کے صرف دنیا میں مشغول رہے۔

150

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے جس ہدایت اور عمل کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس بڑی بارش جیسی ہے جو زمین پر برسے۔ پھر زمین کا جو حصہ زرخیز تھا اس نے بارش کا پانی قبول کر لیا اور پھر اس نے گھاس اور ہرا چارہ خوب اگایا اور زمین کا جو حصہ بنجر تھا اس نے بارش کا پانی روک لیا جس سے اللہ نے لوگوں کو نفع پہنچایا۔ پھر وہ پانی ان کے پینے اور ان کی کھیتی کے کام آیا۔ اور زمین کا ایک حصہ ڈھلوان تھا۔ پس اس نے نہ تو پانی کو روکا اور نہ اس نے گھاس اور چارہ اگایا۔ پس یہی اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اور اس کو اس چیز سے نفع پہنچا جس کو لے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔ پھر اس نے اس کو جانا اور اس نے اس کی تعلیم دی اور (دوسری) مثال اس شخص کی بھی ہے جس نے اس کی طرف دیکھنے کے لیے سر نہیں اٹھایا اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 79؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2282)

تشریح: اس حدیث میں تشبیہ کی زبان میں فطرت کے اس قانون کو بتایا گیا ہے جس کو فیض بقدر استعداد کہا جاتا ہے۔ زمین کو بارش کا فائدہ اس کی زرخیزی کے بقدر ملتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ پیغمبر یا پیغمبر کی نیابت میں داعی کے ذریعہ جب

حق کا اعلان کیا جاتا ہے تو اگرچہ یہ اعلان تمام انسانوں تک پہنچتا ہے مگر اس کا فائدہ ہر ایک کو اس کی اپنی صلاحیتِ قبولیت کے بقدر ملتا ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایتِ الٰہی سے ملتا ہے، وہ معرفت ربانی ہے۔

ہر عورت اور مرد کے اندر سچائی کو پانے کا جذبہ چھپا ہوا ہے، سچائی ہر ایک کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔ مگر انسان اس دنیا میں افکار کے جنگل کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ اس بنا پر انسان کے اندر سچائی کو اختیار کرنے کا عمل (process) درست طور پر جاری نہیں ہو پاتا۔ ضرورت ہے کہ وہ اپنے اندر وہ فکری استعداد پیدا کرے جس کے ذریعے وہ حق اور غیر حق کے فرق کو جانے۔ وہ ناحق کو چھوڑتے ہوئے حق پر اپنی نظر جمائے رکھے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو کسی انسان کے لیے سچائی سے فائدہ اٹھانے کا ضامن ہے۔

151

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن (سورہ آل عمران) کی یہ آیات پڑھیں: وہی ہے جس نے تمھارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (3:7)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کی آیاتِ متشابہات کے پیچھے پڑ گئے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ پس تم ان سے بچو۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 4547؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2665)

تشریح: دین کی جن باتوں کا تعلق ہماری معلوم دنیا سے ہے، ان کو قرآن میں محکم یا صراحت کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنے براہِ راست اسلوب کی بنا پر سمجھنے والے کے لیے بالکل واضح ہیں۔ اور جن باتوں کا تعلق نامعلوم دنیا سے ہے ان کو متشابہ یا تمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً

”الطَّلاقُ مَرَّتانِ (2:229)۔یعنی، طلاق دو بار ہے“ایک ایسی آیت ہے جومحکم زبان میں ہے۔اسی طرح إِنَّ الصَّلاةَ كانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتاباً مَوْقُوتاً (4:103)۔یعنی، بیشک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے۔ یہ بھی محکم اسلوب کی ایک مثال ہے۔ان دونوں آیتوں کے مفہوم کو ہم پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جہاں تک محکم آیتوں کا تعلق ہے، ایسی آیتیں انسان کے دائرۂ علم سے تعلق رکھتی ہیں۔اُن کی تفصیلات جاننے کے لیے انسان مکمل تحقیق اور غور وفکر کرسکتا ہے۔مگر جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں طالبِ قرآن کو اجمالی مفہوم پر اکتفا کرنا چاہیے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بجا طور پر کہا ہے:أَبهِمُوا مَا أَبهَمَ اللّٰه (الاصل لمحمد بن الحسن، جلد 10، صفحہ 182)۔یعنی تم اُس چیز کو غیر واضح رہنے دو جس کو اللہ نے غیر واضح رکھا ہے۔

متشابہ اسلوب کی ایک مثال یہ آیت ہے: يَداهُ مَبْسُوطَتانِ (5:64)۔یعنی، خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یہ غیب کی بات ہے۔اللہ کا ہاتھ کیسا ہے، اُس کو جاننا ہمارے لیے ممکن نہیں۔اس کا مفہوم ہم صرف اجمالی زبان میں سمجھ سکتے ہیں۔کلی اور حتمی طور پر اُس کا مفہوم اس دنیا میں سمجھا نہیں جاسکتا۔اس قسم کی باتوں کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے۔انسان کے سامنے ان کو قابل فہم بنانے کے لیے انھیں تشبیہ وتمثیل کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تمثیلات پر مجمل انداز میں ایمان رکھنا چاہیے۔تمثیل کی تفصیلات تلاش کرنا ایک غیر سنجیدہ فعل ہے جو ذہنی انتشار کے سوا آدمی کو کہیں اور نہیں پہنچاتا۔ یہی لوگ ہیں جن کو قرآن کی مذکورہ آیت میں اصحابِ زیغ کہا گیا ہے، یعنی سچائی سے بھٹکنے والے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ عز وجل فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا، وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا، وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا۔(سنن الدارقطنی، حدیث نمبر 4396) یعنی، اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو فرض قرار دیا ہے، تو ان کو ترک نہ کرو، کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا تو ان کی خلاف ورزی نہ کرو، اور کچھ حدود قائم کیے تو اس سے آگے نہ بڑھو، اور کچھ چیزوں کے بارے میں اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے بھولے بغیر، تو اس کے بارے میں چھان بین نہ کرو۔

ڈائری 1986

4 جون 1986

تبلیغی جماعت کے دو آدمی ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے مولانا عمر پالن پوری کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔

مولانا عمر پالن پوری تبلیغی جماعت کے خاص مقرر ہیں۔ وہ روزانہ بلاناغہ تبلیغی مرکز نظام الدین میں تقریر کرتے ہیں۔ مذکورہ حضرات نے بتایا کہ ان کا ایک خاص انداز یہ ہے کہ وہ بالکل سادہ اور عام فہم مثالیں دیتے ہیں۔ مثلاً آج کی تقریر میں وہ یہ بتا رہے تھے کہ دنیا کی چیزیں خدا کے محبوب بندوں کو بھی ملتی ہیں اور خدا کے مبغوض بندوں کو بھی۔ بظاہر ملنے کے اعتبار سے دونوں یکساں نظر آتے ہیں، مگر دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ انہوں نے مثال دی کہ طوطے کے پنجرے میں بھی روٹی ڈالی جاتی ہے اور چوہے کے پنجرے میں بھی۔ مگر دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ چوہے کو روٹی اس کو پکڑنے کے لیے دی جاتی ہے، جب کہ طوطے کو روٹی اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اس کے لیے غذا بنے۔

میں نے کہا کہ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے مشن اور تبلیغی جماعت کے مشن میں کیا فرق ہے۔ یہ فرق طریقِ اظہار کا ہے، نہ کہ حقیقت کا۔ تبلیغ کے لوگوں کا خطاب زیادہ تر عوام سے ہوتا ہے، اس لیے وہ دین کی بات کو بالکل سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں۔ میرا خطاب خواص (تعلیم یافتہ طبقہ) سے ہے۔ اس لیے ہم اسی دینی پیغام کو علمی انداز میں اور جدید اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔

5 جون 1986

ہر سال رمضان میں کسی رات کو ایسا ہوتا ہے کہ مجھ پر خصوصی کیفیات گزرتی ہیں۔ جن سے مجھے گمان ہوتا ہے کہ غالباً آج ہی شب قدر ہے۔ اس سال (رمضان 1306ھ) میرا گمان ہے کہ شب قدر 25 رمضان کی رات کو پڑی۔

آج کی رات مجھے دوسری راتوں سے کم نیند آئی۔ پھر صبح کو فجر کے وقت خاص کیفیت طاری ہوئی

اورایک ایسی دعا نکلی جو اس سے پہلے کبھی نہ نکلی تھی۔ میری زبان پر بے اختیارانہ یہ الفاظ جاری ہو گئے:

خدایا! تیرے بندے سلیمان نے تجھ سے ایسی حکومت مانگی تھی جو کسی اور کو نہ ملی ہو۔ وہ ایک پیغمبر تھے اور اس دعا کے سزاوار تھے۔ میں ایک عاجز اور گنہ گار بندہ ہوں۔ میں تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ تو میری ایسی مدد کر جو تو نے کسی کی نہ کی ہو۔ یہ کہ تو مجھے قیامت کے دن بلا استحقاق بخش دے۔ میری ساری خطاؤں اور کوتاہیوں کے باوجود مجھے جنت میں داخل کر دے۔

فجر کے وقت جب مجھ پر یہ کیفیت گزری، اس وقت میرے ذہن میں کوئی حدیث وغیرہ نہ تھی۔ بعد کو مجھے ایک حدیث یاد آئی جو مذکورہ گمان کی بالواسطہ تصدیق کرتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول! اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو میں کیا کروں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دعا کرو:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی (جامع الترمذی، حدیث نمبر 3513)۔

یعنی، اے اللہ! بے شک تو معاف کرنے والا ہے۔ تو معافی کو پسند کرتا ہے۔ پس مجھے معاف کر۔"

اس حدیث سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ شب قدر کی تاریخ اگرچہ نص کے ذریعہ متعین نہیں ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ کوئی بندۂ خدا اپنے ذاتی احساسات کے تحت اس کا ادراک کر سکے۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس مبارک لمحات سے کسی کا ربط قائم ہو تو اس پر سب سے زیادہ جو کیفیت طاری ہوگی وہ استفسار کی کیفیت ہے۔ جس کا ایک نمونہ مذکورہ دعا کے الفاظ میں ملتا ہے۔

6 جون 1986

دہلی کے زو (Zoo) میں ایک گینڈا تھا، جس کا نام روزی تھا۔ 30 مئی 1986 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اس کی عمر چھ سال تھی۔ اس کا وزن تین ٹن سے زیادہ تھا۔ وہ مادہ گینڈا تھی جو چند سال پہلے چنڈی گڑھ سے لائی گئی تھی تاکہ دونر گینڈے کے ساتھ رہ سکے۔ وہ حاملہ تھی۔ گینڈے کے یہاں عام طور پر 16 مہینے میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جولائی 1986 میں اس کے وضع حمل کی مدت پوری ہو رہی تھی۔

روزی کے بارے میں یہ رپورٹ 31 مئی 1986 کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد جو واقعہ گزرا، وہ ٹائمس آف انڈیا، 4 جون 1986 کے الفاظ میں یہ تھا:

"The response to 'The Times of India' story on the sick Rosy was phenomenal. The phone was constantly ringing as several animal lovers sought to keep in touch with her progress."

بیمار روزی کے بارے میں ٹائمس آف انڈیا کی خبر کا رسپانس غیر معمولی تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی کیوں کہ بہت سے جانور سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہر لمحہ اس کی حالت کو جاننا چاہتے تھے۔

میں نے یہ رپورٹ پڑھی تو میرے ذہن میں سوال آیا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگوں کو جانوروں کے ساتھ اتنی ہمدردی ہوتی ہے، مگر یہی ہمدردی ان کو انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ سمجھ میں آیا کہ جانور ہمیشہ اپنے دائرہ میں رہتا ہے، وہ کبھی انسان کو بلا وجہ تکلیف نہیں پہنچاتا۔ جب کہ انسان ہر بار اپنے دائرہ سے باہر آتا ہے اور دوسرے انسانوں کو مختلف طریقہ سے پریشان کرتا رہتا ہے۔

انسان سے محبت کرنے کے لیے وہ دل چاہیے جو دوسرے کی زیادتی کے باوجود اس سے محبت کر سکے۔ چونکہ لوگوں کے پاس اس قسم کا بڑا دل نہیں، اس لیے انسان سے محبت کرنے والے بھی نہیں۔ جانور سے محبت کرنے میں انسان کی بڑائی نہیں چھنتی۔ جب کہ انسان سے محبت کرنا اس وقت ممکن ہے، جب کہ ذاتی بڑائی کا جذبہ آدمی اپنے اندر سے نکال چکا ہو۔

8 جون 1986

7 جون 1986 کے اخبارات میں یہ خبر تھی کہ کنڑ ازبان کے مشہور ادیب ڈاکٹر ماستی وینکٹیش آئنگر (Masti Venkatesha Iyengar) کا 95 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر ماستی 6 جون 1891 کو پیدا ہوئے تھے۔ دوبارہ عین اسی تاریخ 6 جون 1986 کو اس دنیا سے چلے گئے۔ ڈاکٹر ماستی نے جہاں سے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا تھا، وہ دوبارہ وہیں پہنچ گئے۔ ہر آدمی اسی طرح پیچھے کی طرف لوٹتا ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی وفات بھی عین اسی تاریخ کو ہو جس تاریخ کو ان کی پیدائش ہوئی تھی۔

9 جون 1986

ڈاکٹر محسن عثمانی اور جناب اسلم صاحب (آئی اے ایس) ملنے کے لیے تشریف لائے۔ دونوں نے مشترکہ طور پر کہا کہ الرسالہ میں تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ صرف مثبت طور پر اپنی بات پیش کرنی چاہیے۔

میں نے کہا کہ تنقید کو برا ماننا سراسر دورِ تنزل کی بات ہے۔ دورِ عروج میں کبھی تنقید کو برا نہیں مانا جاتا تھا۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں تنقید کا عام رواج تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ تنقید کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے کہا کہ تنقید ہی سے اعلیٰ انسان بنتے ہیں۔ ذہنی بیداری اور شعوری انقلاب کبھی تنقید کے بغیر نہیں آسکتا۔

انہوں نے کہا کہ قرآن میں حکم ہے کہ نبی کا احترام کرو، نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔ میں نے کہا کہ نبی کا معاملہ ایک مستثنیٰ معاملہ ہے۔ نبی کے اوپر آپ علما کو قیاس نہیں کرسکتے۔ ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 459)۔ یعنی، میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیا کی مانند ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علمائے امت کا بھی اسی طرح احترام ہونا چاہیے، جس طرح انبیا کا کیا جاتا تھا۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث علما کے احترام کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ علما کی ذمہ داریوں کے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ کے علما وہ کام کریں گے جو بنی اسرائیل کے انبیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں آیا ہے کہ ان کی رہنمائی برابر انبیا کرتے تھے: كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3455)۔ مگر پیغمبر اسلام کے بعد نبوت ختم ہو گئی۔ اس لیے یہاں انسانوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبر نہیں آئیں گے، بلکہ علما کو وہ کام انجام دینا پڑے گا جس کام کو پہلے انبیا انجام دیتے تھے۔

10 جون 1986

یہ بہت ضروری ہے کہ آدمی جس کام کو لے کر اٹھے، اس کے لیے وہ competent ہو۔ مثلاً مولانا شبلی نعمانی (1857-1914) نے زور وشور کے ساتھ اسلامی تعلیم کا ایشو اٹھایا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے جوابی تحریک اٹھائی کہ اسلامی تعلیم مسلم نوجوانوں کو پیچھے لے جائے گی، کیوں کہ اسلام علم

کا مخالف ہے۔ اس کی مثال یہ دی گئی کہ حضرت عمر کے زمانہ میں جب اسکندریہ (مصر) فتح ہوا تو انہوں نے عظیم یونانی کتب خانہ کو جلا دیا۔ اس طرح دنیا پچھلے انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہوگئی۔ اس کے جواب میں مولانا شبلی نے زبردست تحقیق کر کے بتایا کہ یہ کتب خانہ اسلامی فتح سے بہت پہلے جلایا جاچکا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری میں ایک عیسائی مؤرخ ابو الفرج ملطی نے یہ کیا کہ عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے غلط طور پر اس واقعہ کو مسلمانوں سے منسوب کر دیا۔

اسی طرح مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کی عظمت پر کتابیں لکھیں۔ اس وقت زور شور کے ساتھ یہ بات کہی گئی کہ اسلام مساوات کے خلاف ہے اور اس کی ایک مثال جزیہ ہے۔ جو ان لوگوں کے نزدیک غیر مسلم ہونے کا ٹیکس ہے۔ مولانا شبلی نے دوبارہ نہایت تحقیق کے ساتھ ایک کتاب لکھی کہ جزیہ غیر مسلم ہونے کا ٹیکس نہیں تھا، بلکہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا۔ شبلی کی ان تحقیقات کے بعد مخالف مغلوب ہو کر رہ گیا۔

اس کے برعکس مثال موجودہ زمانہ میں شاہ بانو بیگم کے مسئلہ کی ہے۔ شاہ بانو کے معاملہ میں موجودہ علما نے زبردست طوفان مچایا۔ اور تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اعلان کیا کہ اسلامی شریعت میں مطلقہ کے لیے نفقہ نہیں ہے۔

اب جدید طبقہ کے سامنے دو تصویریں تھیں۔ ایک طرف یہ کہ اسلام ایک مرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی بھی وقت طلاق دے کر رخصت کر دے اور اس کے خرچ کی ذمہ داری نہ لے۔ دوسری طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ ملک کا کریمنل پروسیجر کوڈ (دفعہ 125) یہ تجویز کرتا ہے کہ مطلقہ کو اس کا سابقہ شوہر 500 روپے ماہانہ کی حد تک گزارہ ادا کرے۔ اس تقابل میں انہیں اسلام بظاہر کم تر نظر آیا اور جدید قانون برتر۔ چنانچہ اس صورت حال کو استعمال کر کے غیر مسلموں نے اور جدت پسند مسلمانوں نے اسلام کو خوب بدنام کیا۔ یہاں دوبارہ ضرورت تھی کہ اس موضوع پر تحقیق کر کے دکھایا جائے کہ اسلام کا قانون ہی زیادہ بہتر ہے۔ مگر موجودہ علما میں سے کوئی شخص یہ کام نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت اسلامی کے تحفظ کی تحریک عملاً صرف شریعت اسلامی کو degrade کرنے پر ختم ہوگئی۔

ایک رجل سعید کا انتقال

معروف دینی ادارہ جامعہ دارالسلام عمرآباد (تامل ناڈو) کے جنرل سکریٹری مولانا کا کا سعید احمد صاحب عمری (پیدائش 1936) کا 11 مئی 2024 کو انتقال ہوگیا۔ آپ کا تعلق ساؤتھ انڈیا کے ایک تجارتی خاندان سے تھا، آپ کے دادا کا کا محمد عمر (وفات 1927) نے جامعہ دارالسلام قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے تعلق سے مولانا وحید الدین خاں صاحب نے لکھا ہے کہ "جنوبی ہند میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے جو جامعہ دارالسلام، عمرآباد (تمل ناڈو) کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ابتدائی طور پر 1924 میں قائم ہوا اور اب وہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن چکا ہے۔ وہ انڈیا کے چند بڑے اسلامی مدارس میں سے ایک ہے۔ اِس ادارے کی دعوت پر جنوبی ہند کا سفر ہوا۔" (ماہنامہ الرسالہ، اکتوبر 2010)

مولانا کا کا سعید صاحب نے اسی ادارے سے اپنی دینی تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ اپنے بھائی کا کا محمد عمر ثانی کی وفات (1988) کے بعد جامعہ کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ آپ کے زمانے میں جامعہ کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سینئر نائب صدر اور کئی ملی تنظیموں کے ذمہ دار بھی رہے۔ آپ ملت کے ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

محترم سکریٹری صاحب نے اپنے ادارے میں دینی نصاب کے ساتھ عصری نصاب کو بھی شامل کیا تاکہ طلبہ کو دینی بصیرت کے ساتھ زمانے کی بصیرت بھی حاصل ہو۔ اسی طرح آپ نے ماہنامہ راہِ اعتدال (جاری کردہ 1991) کے ذریعے امت میں اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر متحد و متفق رہنے کی ترغیب دی۔ جامعہ کے تحت چلنے والے ادارۂ تقابلِ ادیان میں آپ انڈیا کے مشہور و معروف علما کو بلا کر دعوتی و علمی محاضرات کروایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے کے تحت آپ نے مولانا وحید الدین خاں (وفات 2021) کو تین دن کے لیے جون 2010 میں جامعہ دارالسلام مدعو کیا تھا۔ یہ رودادِ سفر ماہنامہ الرسالہ اکتوبر 2010 کے خصوصی شمارے میں "جنوبی ہند کا سفر" کے عنوان سے شائع ہو چکی

ہے۔ اِس سے پہلے بھی مولانا وحید الدین خاں صاحب کو جامعہ دار السلام کی گولڈن جوبلی، اپریل 1977 میں مدعو کیا گیا تھا۔ جس میں مولانا نے "اسلامی انقلاب: تاریخ انسانی کے لیے نیا موڑ" کے عنوان سے ایک علمی وفکری مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ مولانا کی کتاب، ظہورِ اسلام میں شامل ہے۔

محترم سکریٹری صاحب بڑے سادہ مزاج تھے۔ آپ کی سادہ مزاجی کا ایک واقعہ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنے سفر عمر آباد کا ایک تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے، "(ایک) مجلس کے دوران مولانا کاکا سعید احمد عمری میرے کمرے میں آئے۔ اس وقت وہاں کئی اساتذہ، دعاۃ (اور ادارۂ تقابلِ ادیان کے طلبا) بیٹھے ہوئے تھے، جو اُن کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ کاکا صاحب نے ان لوگوں کو سختی کے انداز میں کھڑے ہونے سے منع کیا اور کہا کہ آپ لوگ جیسے بیٹھے ہیں، اُسی طرح بیٹھے رہیں، اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس کے بعد کاکا صاحب خاموشی کے ساتھ کمرے میں ایک طرف خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ منظر میں نے صرف جامعہ دار السلام میں دیکھا"۔ (الرسالہ، اکتوبر 2010)

راقم الحروف نے انتہائی قریب سے محترم سکریٹری صاحب کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کی شخصیت کی چند قابلِ نمونہ خصوصیات یہ تھیں: آپ بے حد سادہ مزاج، اور تکلفات سے خالی تھے، بولڈ فیصلہ لینا (bold decision)، ہر چھوٹی بڑی نعمت کی قدر کرنا، سنجیدگی ومتانت اور وقت کی بے انتہا پابندی، وغیرہ۔ آپ نہ صرف اپنی تربیت وتزکیہ کے لیے کوشاں رہتے تھے، بلکہ اپنے ادارے کے افراد کی تربیت کے لیے بھی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے۔ آپ بہت ہی دردمندی کے ساتھ اس قسم کی باتیں دہرایا کرتے تھے — ربانی انسان بننا، انسانیت کے لیے خیر خواہ بننا، نارِ جہنم سے خود بھی بچنا اور برادران وطن کو بھی بچانا، وغیرہ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دعوت وتبلیغ کے فیلڈ میں میرے آنے کا ایک محرک محترم سکریٹری صاحب تھے۔ جامعہ سے فراغت کے بعد میں روزگار کے لیے قطر چلا گیا۔ اس دوران جناب سکریٹری صاحب قطر آئے اور دعوت کی اہمیت اور ہندستان میں اس کے لیے سازگار ماحول کو بیان

کیا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ دینی تعلیم کا اصل مقصد تو دعوت الی اللہ ہے، چنانچہ میں قطر سے انڈیا واپس آ گیا، اور محترم سکریٹری صاحب کی مدد سے اس میدان میں لگ گیا۔

محترم سکریٹری صاحب نے گزشتہ سال کے تقسیمِ اسناد کے سالانہ اجلاس (5 مارچ 2023) میں اپنے فارغین کو نصیحت کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا ان میں سے چند باتیں یہ ہیں "فکری اختلاف کے باوجود دوسروں کو برداشت کیجیے۔ دوسروں سے حسنِ ظن رکھیے۔ اُن کی خدمات اور خوبیوں کا اعتراف کیجیے۔ ہر حال میں دین کی خدمت ہو۔ یہی خلوص کی پہچان ہے۔ حقیقت پسندی کے ساتھ سوچیے تو اِن حالات کے لیے ہم مسلمان بھی ذمے دار ہیں۔ اگر ہم نے اپنے اخلاق و کردار سے اسلام کی درست ترجمانی کی، اور اسلام کا پیغام برادرانِ وطن تک پہنچانے کی کوشش کی تو، ان شاء اللہ، یہ اندھیرا چھٹ سکتا ہے۔ دعوتِ دین سراسر محبت اور ہمدردی کا کام ہے۔ اس درد کے ساتھ ہمیں برادرانِ وطن کو اپنی محبت کا موضوع بنانا ہے۔ اپنی صالحیت اور صلاحیت، دونوں کا معیار بلند کرنے کی فکر کیجیے تبھی آپ زمانے کے ساتھ چل سکیں گے۔" (بحوالہ مولانا محمد رفیع کلوری عمری، مدیر مسئول ماہنامہ راہِ اعتدال، عمرآباد) اس قسم کی نصیحتیں آپ ہمیشہ جامعہ کے فارغین کو کیا کرتے تھے۔

محترم سکریٹری صاحب کی وفات ہمارے لیے یقیناً غم کا باعث ہے مگر اللہ تعالیٰ کے منصوبۂ تخلیق سے کسی کو استثنا حاصل نہیں، ہر ایک کو لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ تاہم قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ محترم سکریٹری صاحب نے اپنے پیچھے نیک وارثین اور اپنے ادارے کے صالح فارغین کی بڑی تعداد کو چھوڑا ہے۔ پوری امید ہے کہ محترم سکریٹری صاحب کے بعد ان سے فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کے مصداق ثابت ہوں گے: إِذَا مَاتَ مِنَّا سَيِّدٌ قَامَ سَيِّدٌ (جب ہم میں سے ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے)۔ وہ محترم سکریٹری صاحب کے بعد بھی ربانیت اور دعوت کے راستے پر قائم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ محترم سکریٹری صاحب کی مغفرت کر کے جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے گا۔ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمرآباد)

خبر نامہ اسلامی مرکز — 283

- 3 تا 21 جنوری 2024 چنئی میں بپاسی (BAPASI) کے زیر اہتمام 47 واں بک فیئر منعقد ہوا۔ جس میں سی پی ایس تامل ناڈو کے خطیب اسرار الحسن، کلوندیم احمد، تاج الدین، فیض احمد قادری اور اقبال عمری نے اسٹال کا انتظام سنبھالا۔ اسٹال پر گڈ ورڈ بکس اور الرسالہ مشن کی کتابیں انگریزی اور تمل زبان میں رکھی گئیں۔ ساتھ میں مختلف زبانوں میں تراجمِ قرآن کے نسخے بھی رکھے گئے۔ اکثر لوگوں نے بڑے شوق سے قیمتاً قرآن حاصل کیا۔ بہت سے لوگوں کو اسپر یچول گفٹ کے طور پر قرآن اور دیگر اسلامک لٹریچر دیے گئے۔ دعوت الی اللہ کے لیے بک فیئر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک غیر مسلم بھائی بک فیئر کے آخری دن ملاقات کے لیے آئے اور اس بات کا اظہار کیا کہ میں صرف آپ لوگوں سے ملاقات کرنے اور شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کیوں کہ آپ نے مجھے گذشتہ بک فیئر میں ایک تمل ترجمۂ قرآن کا نسخہ گفٹ کیا تھا، میں اس کو مسلسل پڑھ رہا ہوں۔
- قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (NCPUL) کے زیر اہتمام ممبئی میں 6 تا 14 جنوری 2024 اردو بک میلہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اسٹال کا انتظام جناب نصیر اللہ صاحب (بنگلور)، آصف خان صاحب (کانپور) اور حافظ سید اقبال عمری (تمل ناڈو) نے سنبھالا۔ بک فیئر میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں اور گڈ ورڈ کی چلڈرن بکس کافی دلچسپی کے ساتھ خریدی گئیں۔ ممبئی سی پی ایس ٹیم سے ہر دن کوئی نہ کوئی ساتھی ہمارے ساتھ میلہ میں شرکت کرتا تھا۔ اس دوران الرسالہ مشن کے قدیم ساتھیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان لوگوں نے مشن کے لیے اپنی جدو جہد کا تذکرہ کیا۔ جیسے ایک بزرگ ساتھی جناب الطاف صاحب نے فرمایا کہ آج جس BKC گراؤنڈ میں بک میلہ لگا ہوا ہے ایک زمانے میں یہاں جنگل ہوا کرتا تھا۔ اس میدان میں پہلا تبلیغی اجتماع ہوا تو میں اس موقع پر الرسالہ مشن کی کتابیں ایک بیڈ شیٹ میں لپیٹ کر کندھے پر لاد کر اجتماع گاہ میں پہنچا تھا اور کتابیں فروخت کی تھیں۔ پھر انھوں نے مولانا کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور دعوتی واقعات کا تذکرہ کیا۔ مثلاً یہ کہ مولانا کو آر ایس ایس کے لوگ اپنے پروگراموں میں بطور مہمان بلایا کرتے تھے اور نماز وغیرہ کی سہولیات بھی مہیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اسٹیج پر ہی نماز کا وقت ہو گیا تو ان لوگوں نے وہیں نماز پڑھنے کا انتظام کیا۔ مولانا اسٹیج پر سب کے سامنے نماز ادا کرنے لگے۔ جب مقرر نے مولانا کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی اپنی تقریر روک دی تھی۔ چنانچہ ہزاروں ہندوؤں کے مجمع نے انتہائی خاموشی کے ساتھ مولانا کے نماز ادا کرنے کا مشاہدہ کیا۔ (مولانا سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)
- On March 11, 2024, CPS International hosted an 'Interfaith' gathering, welcoming a delegation from the United States. The delegation was led by Dharmacharya Mr. Shantum Seth, representing the Zen tradition. The dialogue was led by Dr. Farida Khanam, alongside members of CPS. After the program the delegates were given books as spiritual gifts.
- Good day, I received the Quran translation and the book you sent, and I

want to thank you so much for providing these. This is by far the best translation of the Quran I have come across, especially as someone who is learning about Islam. I often encounter many confusing things online and in books, which make it difficult for me to stay focused on the true message. I've gone through the many resources available online for reading, but I was wondering if there is something that provides a summary of each Surah (chapter) of the Quran? An explanation that briefly talks about what each chapter is about, its meaning, origin, etc. Your help would be greatly appreciated.Thank you for your support! (Ali Martinez via Email)

- To: **aleem****@gmail.com, May 6, 2024, Subject: The Quran:

  I was given The Quran translation at an Egyptian restaurant in Orlando (Florida, USA). I am 42 years old. Raised Christian, baptized as a little girl. I opened the Quran and began to read it. I am overcome with emotions. I am only at the beginning, The Heifer. I have read every page from Introduction to Heifer. I commit to reading the entire thing. I have never felt so close to God in my life: “So remember Me; I will remember you.” (2:152)

  When I read that part, I cried. I felt at peace. I felt protected. I felt safe. I felt that God is near. I felt a love that I have never felt before. I can't wait to keep reading. Most times, I can't put it down, but I have to because I have to work and take care of my son (I'm a single mother; my son is 10 years old). I can't put it down. I would read all night if I could, but I have to get up early. I take notes, go online, and look for answers. I find fulfillment in the Quran.

- AsSalamu alaykum wa rahmatullahi wa barakatuh, My name is Yumna Buhidma, and I am the Finance Officer of the University of Ottawa Muslim Student Association (UOMSA) in Canada. I wanted to get in touch with you about ordering Quran translations to distribute to students. As you may know, Canada has two official languages, English and French, and so as a Muslim Student Association, it's very important that we provide accessible Islamic resources to people in both languages. I wanted to know if it's possible to place an order for 100 copies of the French Quran and was also wondering if there is any deal that we can agree on (such as a bulk discount or any special offers). As a Muslim Student Association, we really try to make the best use of our funds, so any help or deal that we can agree upon is greatly appreciated. Jazakum Allahu khairan.

फिरक़ावाराना मेलजोल

एक हिन्दू भाई से इस बात पर बात हो रही थी कि हिन्दुओं और मुसलमानों के दरमयान जो नफ़रत पैदा हो गई है, उसको किस तरह ख़त्म किया जाए। उन्होंने जोश भरे अन्दाज़ से कहाः जब बिड़ला मन्दिर में नमाज़ होगी और जामा मस्जिद में आरती लगाई जाएगी, तब कुछ बात बनेगी।

यह किसी एक आदमी की बात नहीं। इस मुल्क में बहुत से लोग इसी अन्दाज़ में सोचते हैं। उनका ख़याल है कि हिन्दुओं और मुसलमानों में फिरक़ावाराना भाईचारा लाने का राज़ सिर्फ़ यह है कि दोनों मज़हबों का फ़र्क़ मिटा दिया जाए। दोनों को मिला कर एक मज़हब जैसा बना दिया जाए। इस तरह का मिश्रण सरासर नामुमिकन है। और जो चीज़ नामुमिकन हो वह कभी किसी मसले का हल नहीं बन सकती। हल वह है जो मुमकिन हो, क़ाबिले-अमल यानी व्यावहारिक हो।

हक़ीक़त यह है कि दोनों मज़हबों में तालमेल पैदा करने का एकमात्र राज़ रवादारी (tolerance) है। रवादारी ही के ज़रिए इससे पहले दोनों फ़िर्क़े मेल-मिलाप से रहते थे। इसी के ज़रिए आज भी बहुत से मुल्कों में अगल-अलग मज़हब के लोग मिल-जुल कर ज़िन्दगी गुज़ारते हैं। और इसी के ज़रिए से हिन्दुस्तान में भी दोबारा साम्प्रदायिक भाईचारा लाया जा सकता है।

अमरीका और कनाडा में कोई यहूदी चर्च के अन्दर अपनी इबादत नहीं करता, इसी तरह वहां कोई ईसाई सेनेगाग में जाकर अपना इबादती अमल अंजाम नहीं देता। वहां हिन्दू भी हैं और मुस्लिम भी। मगर कभी ऐसा नहीं होता कि हिन्दू मस्जिद के अन्दर अपनी पूजा कर लें और मुसलमान मन्दिर के अन्दर जाकर नमाज़ अदा करें। इसके बावजूद वहां मुकम्मल फिरक़ावाराना तालमेल मौजूद है। इसकी वजह यही है कि वहां के लोग एक-दूसरे के मज़हबी मामले में रवादारी और सहिष्णुता का तरीक़ा इख़्तियार किए हुए हैं।

फिरक़ावाराना मेलजोल और भाईचारे की तलब एक सही भावना है। मगर इसके लिए ऊपर वाली तदबीर सही नहीं, वही तदबीर सही तदबीर है जिसको अपनाना अमली तौर पर मुमकिन हो। नामुकिन तदबीर को तदबीर नहीं कहा जा सकता। और फिरक़ावाराना मेल-मिलाप के लिए आज़माई हुई तदबीर सिर्फ़ एक है और वही है जिसको रवादारी कहा जाता है। ज़ाती इख़्तिलाफ़ और मतभेद को गवारा करते हुए मुत्तहिदा (एकतापूर्ण) ज़िन्दगी गुज़ारना।

स्वाभाविक सज्दा

इस पृष्ठ के नीचे एक तस्वीर दी जा रही है। इसमें एक आदमी 'सज्दे' की हालत में दिखाई देता है लेकिन यह मस्जिद का या नमाज़ का सज्दा नहीं है, बल्कि मानव स्वभाव का सज्दा है। यह भारतीय संसद के नए सदस्य सुभाष चन्द्र नायक हैं। 9 जुलाई 1991 को जब वह पहली बार पार्लियामेंट हाउस पहुंचे तो उसकी सीढ़ियों पर चढ़ते हुए उनके अन्दर ग़ैरमामूली तौर पर सम्मान का भाव उभरा और वह अनायास पार्लियामेंट के सामने 'सज्दे' की मुद्रा में गिर पड़े।

Mr Subash Chandra Nayak, Congress MP from Orissa, a first timer in the Lok Sabha, kneels down in symbolic respect to Parliament House, on Tuesday. —TOI

सज्दे की अवस्था समर्पण की चरम अवस्था है। इन्सान के अन्दर जब किसी चीज़ के लिए सम्मान और समर्पण का भाव चरम सीमा पर पहुँचता है और वह अपने आपको उस चीज़ के आगे डाल देना चाहता है तो उसका शारीरिक अस्तित्व जिस आखिरी हालत में ढल जाता है वही सज्दा है। सज्दे की हालत समर्पण की आख़िरी हालत है। इसके बाद व्यावहारिक समर्पण का और कोई दर्जा नहीं। सज्दे की हालत में अपने आपको पहुंचा कर इन्सान इस एहसास से दो-चार होता है कि उसने अपने आपको आख़िरी हद तक हवाला किए जाने वाले के हवाले कर दिया। यही वजह है कि जब भी किसी इन्सान के अन्दर पूर्ण समर्पण की ख़्वाहिश उभरती है तो वह फ़ौरन सज्दे की हालत में गिर जाता है।

> Mr. Subash Chandra Nayak, Congress MP from Orissa, a first timer in the Lok Sabha, kneels down in symbolic respect to Parliament House, on Tuesday. —*Times of India*

इसकी एक मिसाल उपरोक्त घटना है।

यहां दी गई यह तस्वीर (टाइम्स ऑफ इंडिया, 10 जुलाई 1991) के फोटोग्राफर ने दसवीं लोक सभा के शपथ ग्रहण समारोह के मौके पर खींची थी। उस दिन लोक सभा अध्यक्ष की तरफ़ से नवनिर्वाचित सदस्यों को शपथ दिला कर दसवीं लोक सभा का औपचारिक गठन किया गया था। लोकसभा में 507 निर्वाचित सदस्य हैं। उनमें से आधे सदस्य नए हैं। उन्हीं में से एक श्री सुभाष चन्द्र नायक हैं। वह जब नई दिल्ली के भव्य संसद भवन के सामने पहुंचे और उसमें दाखिल होने लगे तो वह घटना घटी, जिसे अख़बारी रिपोर्टर के कैमरे ने रिकार्ड कर लिया। संसद की महानता और पवित्रता के एहसास से वशीभूत होकर वह उसके आगे सज्दे में गिर पड़े।

सज्दा इन्सान की फ़ितरत और प्रकृति में शामिल है। इन्सान का पूरा वजूद, पूरा आस्तित्व इस तरह बनाया गया है कि वह किसी के आगे सज्दे में गिर जाना

चाहता है। आदमी के अन्दर स्वाभाविक रूप से यह भाव छुपा हुआ है कि 'तू बड़ा है, मैं छोटा हूँ।' यह अन्दरूनी एहसास जब तीव्र होकर, शिद्दत इख़्तियार करके प्रत्यक्ष रूप में ढल जाए तो इसी का नाम सज्दा है।

क़ुरआन में है कि मैंने जिन्न और इन्सान को सिर्फ़ अपनी इबादत के लिए बनाया है (अल-ज़ारियात 56)। इसका मतलब यह है कि इन्सान के अन्दर इबादत और सज्दा करने का जज़्बा छुपा हुआ है और वह मूलतः सृजनहार के लिए है। इसका सही इस्तेमाल यह है कि आदमी संसार के पालनहार को सज्दा करने वाला बन जाए। पर जो लोग ख़ुदा को पाए हुए न हों वे अपनी बेख़बरी के कारण किसी गैर-ख़ुदा को सज्दा करने वाले बन जाते हैं।

इस घटना से यह बात और भी मालूम हुई कि तौहीद (एकेश्वरवाद) की दावत एक ऐसी दावत है जिसका आधा रास्ता पहले ही तय हो चुका है। इन्सान अपनी जन्मजात प्रकृति के तहत पहले से ही अपने अन्दर यह तत्परता और यह आग्रह लिए हुए है कि वह किसी बड़ी हस्ती के आगे अपने आप को झुका दे। अब सच्चाई की तरफ़ बुलाने वालों का काम सिर्फ़ इतना है कि वे इन्सान को यह बता दें कि तुम्हारी प्रकृति जिस हस्ती के आगे झुकना चाहती थी वह हस्ती दरअस्ल तुम्हारा सृजनहार है।

इस मामले में एक फ़ारसी शायर का एक शेर याद आता है, जिसका अर्थ है: सारे हिरन अपना सिर हथेली पर लिए हुए इस इंतिज़ार में हैं कि तू आए और उनका शिकार करे।

कारोबारी स्थायित्व

खुशहाल तबक़ा नाश्ते में या चाय के साथ अनाज की बनी हुई हल्की चीज़ें लेना पसंद करता है। इसी का एक रूप वह हल्का खाद्य है, जिसको

कॉर्नफ्लैक्स कहा जाता है। इसकी विभिन्न क़िस्में बाज़ार में मौजूद हैं।

बहुत-सी फ़र्मों ने विभिन्न नामों से कॉर्नफ्लैक्स बनाए। उनके स्वाद में तरह-तरह की विविधता पैदा की। पर भारतीय बाज़ार में वे ज़्यादा कामयाब न हो सके, हालांकि उन्होंने विज्ञापन पर काफ़ी पैसा ख़र्च किया।

इस वक़्त भारत के बाज़ार में सिर्फ़ दो फ़र्मों के बनाए हुए कॉर्नफ्लैक्स ज़्यादा चल रहे हैं। एक हिन्दुस्तान वेजिटेबल्स आइल्स कार्पोरेशन का और दूसरा मोहन मीकिन्स लिमिटेड का। ये दोनों फ़र्में हर साल एक हज़ार टन कॉर्नफ्लैक्स बेचती हैं, जिनकी क़ीमत तीन करोड़ पचास लाख होती है, हालांकि ये दोनों फ़र्में विज्ञापन पर सिरे से कोई पैसा ख़र्च नहीं करतीं। उनका तैयार किया हुआ कॉर्नफ्लैक्स बिना किसी विज्ञापन के बिकता है।

इस फ़र्क़ की वजह क्या है ? इसकी बुनियादी वजह यह है कि दूसरे फ़र्मों का कोई इतिहास नहीं। उन्होंने किसी नाम से कॉर्नफ्लैक्स की एक किस्म बनाई। वह बाज़ार में नहीं चली तो उन्होंने दूसरी क़िस्म बना डाली या सिरे से उसको बनाने का काम छोड़ कर कोई दूसरा काम शुरू कर दिया। इसके विपरीत उपरोक्त दोनों कामयाब फर्मों के कारोबार के पीछे बीस साल का इतिहास है। वे बीस साल से लगातार एक ही क़िस्म का कॉर्नफ्लैक्स बना रही हैं। बीस वर्षीय इतिहास ने उनको लोगों की नज़र में जाना-पहचाना और मान्यताप्राप्त बना दिया है। किसी आदमी को कॉर्नफ्लैक लेना होता है तो उनके ज़ेहन में पहले से उसका नाम मौजूद होता है और वह बाज़ार जाकर अपने इस जाने-पहचाने कॉर्नफ्लैक्स को खरीद लेता है।

यही कारोबार में तरक्की का राज़ है। कारोबार में ठहराव और स्थायित्व ज़रूरी शर्त है। आप कारोबार करके उसको छोड़ते या बदलते रहते हैं तो आप कभी कारोबार में कामयाब नहीं होंगे। और अगर आप कारोबार करके उस पर जमे रहें, किसी भी कठिनाई की वजह से उसको न छोड़ें तो 'बीस

साल' गुज़रने के बाद आप निश्चित रूप से कामयाबी की अगली मंज़िल पर पहुंच चुके होंगे।

चालीस साल बाद

निकोला चाऊशेक (Nicolae Ceaușescu) रोमानिया का कम्यूनिस्ट लीडर था। 1948 में वह रोमानिया का कृषि मंत्री बना। इसके बाद वह तरक़्क़ी करता रहा। यहां तक कि 1967 में वह रोमानिया का राष्ट्रपति बन गया। अपनी सत्ता को मज़बूत बनाने के लिए उसने हर मुमकिन कार्रवाई की। इसी में यह था कि उसने अपनी बीवी इलेना (Elena) को उपराष्ट्रपति बनाया और ज़्यादातर ओहदों पर अपने रिश्तेदारों को बिठाया।

चाऊशेक ने ताक़त के बल पर अपने तमाम विरोधियों को कुचल दिया। रोमानिया के मशहूर कवि एंडरेन पाऊनेस्को (Adrian Păunescu) के ज़रिए उसने एक कविता तैयार कराई जो 'रोमानिया का गीत' कही जाती थी। इसमें चाऊशेक को 'रोमानी क़ौम का सबसे ज़्यादा प्यारा बेटा' कहा गया था। यह कविता रोज़ाना कई मौक़ों पर सारे रोमानिया में पढ़ी जाती थी। रोमानिया के लोगों को यह बात नापसंद थी कि मुल्क के तमाम साधन सिर्फ एक शख़्स के ऊपर लगा दिए जाएं। आख़िरकार दिसम्बर 1989 में यह लावा फट पड़ा। जनता और फ़ौज दोनों ने चाऊशेक के ख़िलाफ़ बगावत कर दी। चाऊशेक ने अपनी हिफ़ाज़त के लिए इतनी बड़ी पुलिस बना रखी थी जो फ़ौज से भी ज़्यादा ताक़तवर थी। इसलिए दोनों के बीच सख़्त टकराव हुआ। सत्तर हज़ार आदमी मर गए और तीन सौ हज़ार आदमी ज़ख़्मी हुए।

चाऊशेक अपने आलीशान महल में हर वक़्त एक हैलीकाप्टर तैयार रखता था। जब उसने देखा कि अब वह अपनी सत्ता को बचा नहीं सकता तो वह हैलीकाप्टर पर बैठ कर फ़रार हो गया। उसको अन्देशा हुआ कि उसका

हैलीकाप्टर मार कर गिरा दिया जाएगा, तो वह एक जगह पर उतर कर ज़मीन के नीचे बनाई गई पनाहगाह (bunker) में दाख़िल होकर छुप गया। फिर भी वह यहां भी पकड़ लिया गया और ठीक क्रिसमस के दिन 25 दिसम्बर 1989 को चाऊशेक और उसकी बीवी इलेना को गोली मार दी गई - आसमान ने भी उसको जगह देने से इन्कार कर दिया और ज़मीन ने भी।

चाऊशेक स्टालिनवादी कम्यूनिस्ट था। वह मज़हब का सख़्त दुश्मन था। बुखारेस्ट का रेडियो एनाउन्सर उसकी मौत की ख़बर देते हुए चिल्ला उठा। उसने कहा, "उफ़, कैसी हैरतनाक ख़बर है। क्राइस्ट का दुश्मन ठीक क्रिसमस के दिन मर गया।

> Oh, what a shocking news. The anti-Christ died on Christmas Day.

इस तरह की घटनाएं 1989 में बहुत सी हुई हैं। ऐसा मालूम होता है कि ज़ालिम इन्सानों ने मज़हब के ख़िलाफ़ जो किले बनाए थे, वे ख़ुदा की तरफ़ से लगातार ढाए जा रहे हैं।

रूस में सरकारी तौर पर मज़हब का बिल्कुल ख़ात्मा कर दिया गया था। मगर हालात का दबाव इतना बढ़ा कि रूस की कम्यूनिस्ट हुकूमत को अपने यहां मज़हबी आज़ादी का ऐलान करना पड़ा। सोवियत रूस के प्रधानमंत्री मिखायल गोर्बाचोफ़ ने ख़ुद वेटिकन पहुंच कर पोप से मुलाक़ालत की। पूर्वी जर्मनी ने मज़हब को ज़ाहिरी तौर पर पूरी तरह ख़त्म कर दिया गया था। मगर वह आख़िरकार सैलाब बन गया और बर्लिन की दीवार (Berlin Wall) तोड़ कर बाहर आ गया। चाऊशेक अपनी सारी सत्ता, अपनी सारी व्यवस्था और बन्दोबस्त के बावजूद क़त्ल कर दिया गया।

इस तरह सीधे ख़ुदा की तरफ़ से मज़हब की तब्लीग और प्रसार के मौक़े खोले जा रहे हैं।

मौजूदा ज़माने में मुसलमानों ने इस्लाम के नाम पर काफ़ी सरगर्मी दिखाई है मगर ये सरगर्मियां ज़्यादातर राजनीतिक हैं। अब ज़रूरत है कि तमाम सरगर्मियों को दावत और तबलीग के रुख़ पर चलाया जाए। आज के इन्सान को 'सियासी मज़हब' से कोई दिलचस्पी नहीं। वह 'रूहानी मज़हब' की तलाश में है। वह अपनी फ़ितरत में उठने वाली ख़ुदा की तड़प का जवाब चाहता है। अगर इस वक़्त आज के इन्सान के सामने इस्लाम को उसके सादा और स्वाभाविक रूप में पेश कर दिया जाए तो इन्सान महसूस करेगा कि यही वह चीज़ है, जिसको वह अपने अन्दरूनी तक़ाज़े के तहत तलाश कर रहा था।

शहद का सबक़

शहद की मक्खियां फूलों का जो रस जमा करती हैं, वह सब का सब शहद नहीं होता। उसका सिर्फ़ एक तिहाई हिस्सा शहद बनता है। शहद की मक्खियों को एक पौंड शहद के लिए बीस लाख फूलों का रस हासिल करना पड़ता है। उसके लिए मक्खियां क़रीब तीस लाख उड़ानें करती हैं और इस दौरान वह कुल मिलाकर क़रीब पचास हज़ार मील तक का सफ़र तय करती हैं। रस जब ज़रूरी मात्रा में जमा हो जाता है तो इसके बाद शहद बनाने का काम शुरू होता है।

शहद शुरू-शुरू में पानी की तरह पतला होता है। शहद तैयार करने वाली मक्खियां अपने परों को पंखे की तरह इस्तेमाल करके अतिरिक्त पानी को भाप की तरह उड़ा देती हैं। जब यह पानी उड़ जाता है तो इसके बाद एक मीठा द्रव बाक़ी रह जाता है, जिसको मक्खियां चूस लेती हैं। मक्खियों के मुंह में ऐसी ग्रंथियां होती हैं जो मीठे द्रव को शहद में बदल देती हैं। अब मक्खियां इस तैयार शहद को छत्ते के ख़ास तौर पर बने हुए सूराख़ों में भर देती हैं। ये सूराख

दूसरी मक्खियां मोम के ज़रिए बेहद कारीगरी के साथ बनाती हैं। मक्खियां शहद को सूराख़ों में भर कर उसको 'डिब्बाबन्द' खाद्य की तरह सुरक्षित कर देती हैं, ताकि बाद को वह इन्सान के काम आ सके।

इस तरह की बेशुमार व्यवस्थाएं हैं जो शहद की तैयारी में की जाती हैं। ख़ुदा ऐसा कर सकता था कि चमत्कारिक ढंग से अचानक शहद पैदा कर दे या पानी की तरह शहद का झरना ज़मीन पर बहा दे। पर उसने ऐसा नहीं किया। ख़ुदा हर क़िस्म की सामर्थ्य रखने के बावजूद शहद को एक व्यवस्था के तहत तैयार करता है, ताकि इन्सान को सीख मिले। वह जाने कि ख़ुदा ने दुनिया की व्यवस्था किस ढंग पर बनाई है और किन सिद्धांतों और नियमों को अपना कर ख़ुदा की इस दुनिया में कोई शख़्स कामयाब हो सकता है।

शहद की मक्खी जिस तरह काम करती है, उसे योजनाबद्ध कार्य कहते हैं। यही उसूल इन्सान के लिए भी है। इन्सान भी सिर्फ़ उस वक़्त कोई सार्थक सफलता अर्जित कर सकता है, जबकि वह योजनाबद्ध कार्य के ज़रिए अपने मक़सद तक पहुंचने की कोशिश करे। संगठित और योजनाबद्ध कार्य ही इस दुनिया में कामयाबी हासिल करने का एकमात्र विश्वसनीय तरीक़ा है, शहद की मक्खी के लिए भी और इन्सान के लिए भी।

चुप की ताक़त

पुरानी कहावत है कि 'एक चुप हज़ार बला टालती है।' यह कहावत बहुत सार्थक है और लंबे इंसानी तजुर्बों पर आधारित है। हक़ीक़त यह है कि चुप रहना अपने आप में ख़ुद एक ताक़तवर हथियार है, बशर्ते कि इस हथियार को उसके तमाम तक़ाज़ों के साथ इस्तेमाल किया जाए।

1966 की बात है। मैं लखनऊ और शाहगंज के बीच ट्रेन से सफ़र कर रहा था।

यह देहरादून एक्सप्रेस थी और मैं पुराने नाम के मुताबिक़ थर्ड क्लास में और नए नाम के मुताबिक़ सेकंड क्लास के एक डब्बे में था। पूरे डब्बे में शायद मैं अकेला मुसलमान था।

सफ़र के दौरान ऐसा हुआ कि मुझे टॉयलेट जाने की जरूरत पेश आई। मैं अपनी सीट से उठकर टॉयलेट के पास गया। मैंने अपनी आदत के मुताबिक़ दरवाज़ा आहिस्ता से खोला, लेकिन दरवाज़ा ज़रा-सा खुलते ही अंदर से कपड़े का पल्लू दिखाई दिया। मैंने फ़ौरन दरवाज़ा बंद कर दिया और वापस आकर अपनी सीट पर बैठ गया।

वास्तविकता यह थी कि टॉयलेट के अंदर एक हिंदू महिला मौजूद थीं, लेकिन उन्होंने क़ायदे के मुताबिक़ दरवाज़े का बोल्ट नहीं लगाया था।

महिला का पति मेरे पास की सीट पर बैठा हुआ था। इस दृश्य को देखते ही वह बिगड़ गया। वह ग़ुस्सा और नफ़रत से भरकर मेरे ऊपर पिल पड़ा। वह जोश में उठकर खड़ा हो गया और मुझे बुरी तरह डांटना और बुरा-भला कहना शुरू कर दिया। मैंने कहा कि दरवाज़ा अंदर से बंद न था और मुझे मालूम न था कि अंदर कोई है, वरना मैं हर्गिज़ दरवाज़ा खोलने की कोशिश न करता। पर मेरी सफ़ाई का हर शब्द उसको और भी अधिक उत्तेजित कर रहा था। ऐसा लगता था कि वह मुझे खिड़की से बाहर फेंक देगा।

लंबी बोगी पूरी तरह भरी हुई थी, पर पूरे डब्बे में एक शख़्स भी मेरी हिमायत के लिए नहीं उठा। आख़िर में मैं बिल्कुल खामोश हो गया। मैं उस शख़्स की तरफ़ देख रहा था, पर मेरे चेहरे पर डर या उत्तेजना का ज़रा सा भी कोई भाव न था। मैं एकदम भावहीन मुद्रा में स्टेचू की तरह ख़ामोशी के साथ उसको देखता रहा। अब वह ठंडा पड़ने लगा, यहां तक कि बिल्कुल चुप हो गया। दूसरे को चुप करने की सबसे आसान तरकीब है-अपनी ज़ुबान को एकतरफ़ा तौर पर बंद कर लेना।

एक मिसाल

सच्चे इन्सानों को लोगों के बीच किस तरह रहना चाहिए इसकी बेहतरीन मेकेनिकल मिसाल शॉक एब्ज़ारबर (Shock absorber) है। शॉक एब्ज़ारबर का शाब्दिक अर्थ है— झटके को सहने वाला एक यंत्र जो मोटर गाड़ियों में लगाया जाता है और एक्सल और बॉडी के बीच एक किस्म के गद्दे का काम करता है। वह सड़क की सतह पर ऊंच-नीच से पैदा होने वाले झटकों को बॉडी तक पहुंचने से रोकता है:

> A device which on an automobile, acts as a cushion between the axles and the body and reduces the shocks on the body produced by undulations of the road surface (IX / 159)।

अगर आप ट्रेक्टर पर 50 किलोमीटर का सफ़र करें तो आप अपनी मंजिल पर इस तरह पहुंचेंगे कि आप थके हुए होंगे। इसके विपरीत जब आप एक अच्छी मोटर कार पर 50 किलोमीटर की यात्रा करें तो आप मंजिल पर इस तरह उतरते हैं कि आप बिल्कुल तरो-ताज़ा होते हैं।

दोनों गाड़ियों में इस अन्तर का कारण क्या है? इसका कारण शॉक एब्ज़ारबर है। कार जब चलती है तो ज़्यादातर उसका पहिया ऊपर-नीचे होता है, बॉडी ऊपर नीचे नहीं होती। इसके विपरीत जब ट्रैक्टर चलता है तो उसका पहिया और बॉडी दोनों ऊपर-नीचे होते रहते हैं। दूसरे शब्दों में कार उस गाड़ी का नाम है कि जो झटका गाड़ी को लगा वह गाड़ी तक रह गया, वह मुसाफिर तक नहीं पहुंचा। जबकि ट्रैक्टर उस गाड़ी का नाम है कि जो झटका गाड़ी को लगा वह गाड़ी तक नहीं रुका, बल्कि वह मुसाफ़िर तक पहुंच गया।

सच्चा इन्सान दुनिया में कार की तरह चलता है, और झूठा इन्सान ट्रैक्टर की तरह। सच्चे इन्सान के सीने में एक शॉक एब्ज़ारबर होता है जो तमाम झटकों

और सदमों को अन्दर ही अन्दर सहता रहता है, जबकि झूठे इन्सान के अन्दर शॉक एब्ज़ारबर नहीं होता। वह हर झटके को दूसरों तक पहुंचाता रहता है। अच्छा समाज बनाना है तो सच्चे इन्सान बनाइए, क्योंकि दरअसल ये झूठे इन्सान ही हैं जो समाज को बिगाड़ और फ़साद से भर देते हैं।

एकतरफ़ा तरीका

दिल्ली के एक अंग्रेजी अख़बार में मैंने एक लेख पढ़ा। उसका शीर्षक था कि 'दोतरफा तरीका बेहतरीन तरीक़ा है' (Bilateralism is the Best) यानी दो वर्गों के बीच विवाद हो तो उसको हल करने का तरीका यह है कि दोनों 'फिफ्टी फिफ्टी' पर राज़ी हो जाएं। पचास प्रतिशत जिम्मेदारी एक पक्ष ले और पचास प्रतिशत जिम्मेदारी दूसरा पक्ष। इस तरह मामले को ख़त्म कर दिया जाए।

यह बात ग्रामर (व्याकरण) के लिहाज़ से सही, पर हक़ीक़त के हिसाब से ग़लत है। क्योंकि आज की दुनिया में यह अव्यावहारिक है। इस दुनिया में कोई विवाद उसी स्थिति में ख़त्म हो सकता है जबकि एक पक्ष एकतरफा तौर पर इसको ख़त्म करने पर राजी हो जाए। इस लिहाज़ से यह कहना ज़्यादा सही होगा कि एकतरफ़ा तरीक़ा बेहतरीन तरीका है:

Unilateralism is the Best.

पैग़म्बरे- रे-इस्लाम ने झगड़ों और शिकायतों को ख़त्म करने का यही तरीका बताया है। हदीस में कहा गया है: "जो शख्स तुम्हारे साथ बुरा सलूक करे उसके साथ तुम अच्छा सलूक करो।" (*कुन्ज़ल उम्माल*, हदीस संख्या 6929) यानी प्रतिक्रिया और रद्दे-अमल का तरीका न अपनाओ। और न इसका इंतजार करो कि दूसरा पक्ष पचास प्रतिशत झुके तो तुम भी पचास प्रतिशत झुक जाओ। ख़ुदापरस्त इन्सान के लिए यह हुक्म है कि वह एकतरफा सदाचार (हुस्ने-

सलूक) का तरीका अख्तियार करे। इसी एकतरफ़ा सदाचार का नाम सब्र है। और इसी सब्र में बेहतर इन्सानी समाज का रहस्य छुपा हुआ है।

अशुभ से शुभ

एक वृक्ष की सफलता इसी में है कि वह छोटे को बड़ा बना सके, मामूली को विशिष्ट में बदल सके। वह जड़ पदार्थ (बीज) को बढ़ती हुई चीज़ों में बदल देता है। वह बाहर से मिट्टी, पानी और गैस लेता है। और उसको पत्ती, फूल और फल रूप में सामने ले आता है। इसी तरह किसी इंसानी समाज का बेहतर समाज होना इस बात पर निर्भर है कि उसके तमाम लोग यह योग्यता रखते हों कि वे छोटे सलूक को ऊंचे सलूक में बदल सकें।

इस मामले में इंसान के मनोवैज्ञानिक अस्तित्व को भी ऐसा ही होना चाहिए जैसा बनाने वाले ने उसके बॉयलाजिकल (जीव-वैज्ञानिक) अस्तित्व को बनाया है। इंसान जो चीज़ें खाता है उनमें एक अंश शक्कर (चीनी) का होता है। शक्कर अपनी पहले की सूरत में इंसान के लिए बेफ़ायदा है इसलिए इंसान के जिस्म में अग्नाशय (Pancreas) की व्यवस्था की गई है, जिसका काम है शक्कर को ऊर्जा (एनर्जी) में बदल देना। इसी 'बदलने' की योग्यता पर इंसान की ताक़त और स्वास्थ्य निर्भर है। जिस आदमी के जिस्म का यह सिस्टम बिगड़ जाय उसके अन्दर जाने वाली शक्कर ऊर्जा में परिवर्तित नहीं होगी। वह या तो ख़ून में शामिल हो जाएगी या पेशाब के रास्ते बाहर आने लगेगी। इसके बाद इंसान बेहद कमज़ोर हो जायगा। इसी से वह बीमारी पैदा होती है, जिसे मधुमेह (डायबिटीज) कहा जाता है।

यदि एक आदमी डायबिटीज का मरीज़ हो जाए यानी उसकी शारीरिक व्यवस्था शक्कर को ऊर्जा में बदलने की योग्यता खो दे, तो ज़िन्दगी उसके लिए बेमाने हो जायगी। वह सब कुछ होते हुए भी 'बेकुछ' हो जाएगा। इसी

प्रकार जो समाज इस प्रकार के मिज़ाज (योग्यता) को खो दे कि उसके लोग छोटी (मामूली) चीज़ को ऊंची (श्रेष्ठ) चीज़ में ढालने का सबूत न दे सकें तो ऐसा समाज एक बीमार समाज होगा। ऐसे समाज को दुरुस्त करने का उपाय इसके सिवाय कोई नहीं कि उसमें दुबारा यह उच्च योग्यता पैदा की जाय।

आजकल हमारे समाज में जो बिगाड़ और टकराव पाया जाता है, उसका कारण यह नहीं कि लोगों के बीच सांस्कृतिक भेद है। उसका सही कारण यह है कि हमारे समाज के लोग मनोवैज्ञानिक रूप से डायबिटिक हो गए हैं, उनमें शक्कर को ऊर्जा में बदलने की योग्यता नहीं रही। उनमें यह सामर्थ्य नहीं रही कि वे 'बेताक़त' को अपने लिए 'ताक़त' बना लें।

सामाजिक ज़िन्दगी में हमेशा ऐसा होता है कि आदमी के साथ अशोभनीय बातें होती हैं। एक आदमी को दूसरे आदमी के साथ शिकायत पैदा हो जाती है। किसी के हित दूसरे के स्वार्थ से टकरा जाते हैं, एक व्यक्ति ऐसे शब्द बोलता है जिन्हें सुनकर दूसरा व्यक्ति महसूस करता है कि वह उसकी निजी या सामाजिक हैसियत पर चोट कर रहा है, उसकी मानहानि कर रहा है। समाज में इस तरह की घटनाएं अवश्य ही घटती हैं और घटती रहेंगी। हमारे लिए यह सम्भव नहीं है कि हम ऐसी घटनाओं को होने से रोक दें। हमारे लिए जो चीज़ मुमकिन है वह सिर्फ़ यह है कि हम ऐसी घटनाओं से नकारात्क (निगेटिव) प्रभाव न लें।

एक स्वस्थ्य आदमी अपने अन्दर जाने वाली शक्कर को ऊर्जा में बदलता है। तब्दीली की यही प्रक्रिया मनोवैज्ञानिक तौर पर भी होनी चाहिए। इस दुनिया में बेहतर सामाजिक ज़िन्दगी बनाने का रहस्य यह है कि लोगों की चेतना को इस योग्य बनाया जाए कि वे अशोभनीय घटना को शुभ प्रवृत्ति में बदल सकें। वे गुस्से के जवाब में माफ़ी पेश करें और बुराई करने वाले को भलाई का तोहफ़ा दें।

मौजूदा समाज के लोग मनोवैज्ञानिक रूप से डायबिटिक हो गए हैं। उनकी इस मनोवैज्ञानिक बीमारी का इलाज कीजिए। और फिर आप देखेंगे कि जो समाज आपसी मतभेदों और झगड़ों में फंसा हुआ था, वह विविध रंग के पौधों और वृक्षों का खूबसूरत बाग बन गया है।

कुछ मिसालें

हमारे आसपास जो कुछ घटित हो रहा है, उनका गहराई के साथ अध्ययन किया जाए तो यह बात आसानी से समझी जा सकती है कि कल्चर का फ़र्क या कल्चर की समानता असम्बद्ध चीज़ें हैं। इनका एकता से कोई अनिवार्य सम्बन्ध नहीं। चंद मिसालें लीजिए:

बम्बई में पारसी और हिन्दू हज़ार बरस से एक साथ रहते हैं। आप जानते हैं कि पारसी समाज एक बंद समाज है। वे लोग अपने से बाहर शादी-ब्याह को सही नहीं समझते। बम्बई के हिन्दुओं और पारसियों में आपस में शादी-ब्याह नहीं होता (कुछ अपवादों को छोड़ कर, जिन्हें आम परम्परा नहीं कहा जा सकता) इसके बावजूद वहां कभी हिन्दुओं और पारसियों में लड़ाई नहीं हुई। दोनों के बीच बहुत अच्छे और शांतिपूर्ण सम्बन्ध हैं। इससे उल्टी मिसाल हिन्दुओं और सिखों की है। आप जानते हैं कि हिन्दुओं और सिखों में आपसी शादी-ब्याह का बेरोकटोक रिवाज था, पर इन्हीं दोनों फ़िरक़ों में आज पंजाब में इतने बड़े पैमाने पर लड़ाई हो रही है जैसे कि एक-दूसरे के दुश्मन हों।

इसी तरह, मसलन, कहा जाता है कि सभी लोगों की भाषा एक हो जाए तो इसके बाद लोगों के बीच एकता पैदा हो जाएगी, पर यह भी एक निरर्थक और बेफ़ायदा उपाय है। स्विटज़रलैंड में कई भाषाएं प्रचलित हैं। उनमें से तीन भाषाओं को सरकारी भाषा की हैसियत प्राप्त है- फ्रेंच, जर्मन, इटालियन। लेकिन भाषाओं की ज़्यादा तादाद होने के बावजूद उन लोगों के बीच

ज़बरदस्त एकता और सदभाव है। बल्कि स्विटज़रलैंड दुनिया सबसे ज़्यादा शांतिपूर्ण देश है। इससे उल्टी मिसाल पाकिस्तान की है। वहां अधिकृत रूप से केवल एक सरकारी भाषा है। यानी उर्दू। इसके बावजूद पाकिस्तान में इतने आपसी झगड़े हैं कि पाकिस्तान को बने हुए 40 साल से ज़्यादा बीत गए, पर वहां का झगड़ा आज तक ख़त्म नहीं हुआ।

इस तरह की कई मिसालें हैं, जिनसे पता चलता है कि एकता, इत्तेहाद और सदभाव का ताल्लुक़ लोगों के विचार और सोच से है न कि उनके ज़ाहिरी रस्मो-रिवाज से। देश के नागरिकों में यदि सही सोच मौजूद हो और वे ज़िन्दगी गुज़ारने का राज़ जानते हों तो वे ऊपरी फ़र्क़ के बावजूद मिल-जुल कर रहेंगे। इसके विपरीत यदि उनकी सोच दुरुस्त न हो, वे ज़िन्दगी के रहस्य से परिचित न हों तो वे एक-दूसरे से लड़ते-झगड़ते रहेंगे– चाहे उनका ज़ाहिरी कल्चर एक सा क्यों न हो।

सच्चाई यह है कि ज़िन्दगी के मामलों की दुरुस्तगी में असली अहमियत मानसिक रुझान (Attitude of mind) की है। अगर हम इस देश में एकता और आपसी समझ पैदा करना चाहते हैं तो हमें लोगों के नज़रिए को दुरुस्त करना होगा। इस उद्देश्य को पाने का यही एकमात्र रास्ता है और इसके सिवा कोई और रास्ता नहीं।

यह एकमात्र रास्ता आपसी सम्मान और सद्भावना का रास्ता है। लोगों में यह मानसिकता व मिज़ाज पैदा किया जाए कि वे दूसरों के साथ सद्भावनापूर्ण व्यवहार करें, वे हर इन्सान का सम्मान करें चाहे वह अपनी बिरादरी का हो या अपने बाहर की बिरादरी का। यही मिज़ाज एकता और सद्भावना की असली बुनियाद है। यह मानसिकता जहां होगी वहां एकता होगी। जहां यह मिज़ाज न हो वहां किसी और उपाय से एकता पैदा नहीं की जा सकती।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

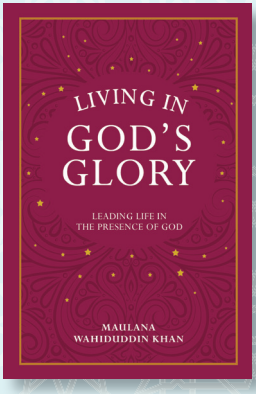

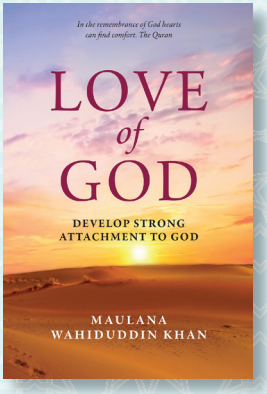

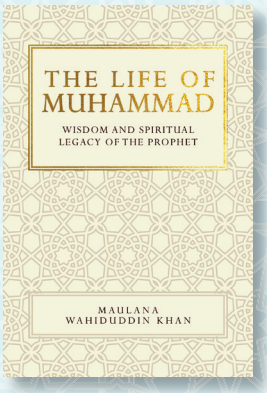

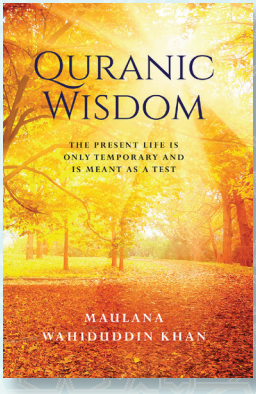

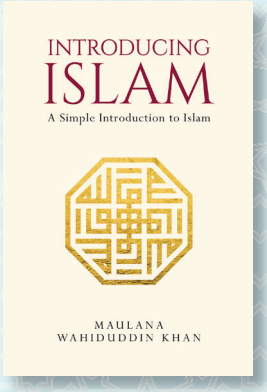

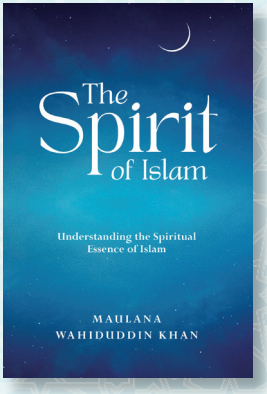

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23